فقیر کی ڈاک

خواجہ شمس الدین عظیمی

فقیر کی ڈاک

انتساب

مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی کے نام

جن کا فیض اور جن کی برکتیں میرے اوپر محیط ہیں۔

فہرست

دیباچہ 9
احمد شمس الدین 22
جناب ابراہیم جلیس صاحب 23
نام-نامعلوم 25
ممتاز علی (جیکب آباد) 34
ایم اے رفیق (مشرقی پاکستان) 37
دین محمد (میرپور خاص) 38
مسعود شاہ (کوہاٹ) 40
کومیلا (مشرقی پاکستان) 42
تسلیم بیگم جی اے (کراچی) 44
یوسف (اسپین) 46
چودھری جلال الدین (لاہور) 49
شمع علیم صاحبہ 52
عزیزی نجم الدین 55
اقبال بیگم 58
بنام اراکین سلسلہ عظیمیہ 63
ڈاکٹر محمد سلیمان خان 65
ڈاکٹر مظفر عظیمی 67
عماد الدین 70
سرفراز مجید 73

فرحانہ انجم صاحبہ 75
رشید صاحب 77
فاطمہ حسن 80
محمد ارشد 82
ایوب کمال 84
صدیقہ حانم 87
عزیزالقدر نعیم احمد (گلاسگو۔یوکے) 90
برخوردار ماجد 92
عزیزی عرفان بساطیہ عظیمی 94
تصدق حسین 96
ڈاکٹر محمد طارق (کوئٹہ) 100
ارشاد علی خان صاحب 104
ڈاکٹر جاوید سمیع 106
اشفاق حسین (مانچسٹر۔برطانیہ) 108
نام۔نامعلوم 110
جمال الدین (لندن) 112
اقبال قریشی صاحب 115
اشفاق عنبر عظیمی صاحب 116
سندر سنگھ 117
محمد اعجاز خان ایڈوکیٹ 120
آصف کامران (کینیڈا) 122

تسنیم اقبال.....125
محمد زاہد وصی عظیمی.....128
سندر سنگھ۔سوات.....129
قندیل(ناروے).....131
مسز نگینہ چنہ.....136
ڈاکٹر شگفتہ فیروز صاحبہ.....138
ارسلان(روس).....141
سید طاہر جلیل.....144
ڈاکٹر ناہید صاحبہ.....148
مقصود احمد.....150
رومانہ عزی(قطر).....153
شیخ نصیر احمد.....155
ظفر(ویتنام).....159
نثار احمد،طاہرہ نثار عظیمی(مانچسٹر).....162
عمران علوی سلمہ!.....166
ڈاکٹر اختر علی(کراچی).....168
رفعت صدیقی.....171
نام۔نامعلوم.....174
ناصر محبوب(ماسکو روس).....177
شبیر احمد(ساہیوال).....180
نظامانی(ٹنڈو جام).....184

غوثیہ احمد 186
عبدالرّحیم نظامانی (ٹنڈو جام) 188
ریاض صاحب 191
جمیل احمد (ہالینڈ) 193
سید افتخار الحسن 197
ڈاکٹر جاوید سمیع (برخیا، ہسپتال، کراچی) 200
یاسر زیشان (سیالکوٹ) 203
محمد عرفان (لاہور) 206
ڈاکٹر مظفر الدین (کراچی) 208
پروفیسر ظفر علی (کراچی) 211
محمد عارف (لاہور) 213
پرفیسر مشتاق (کراچی) 215
ڈاکٹر سنبل کامران (کراچی) 217
اظہر محمود (کراچی) 219
ریحانہ یوسف (کراچی) 221
مبارک النساء 224
ظل ثناء 227
حسن سید (اسلام آباد) 230
عابد محمود (سیالکوٹ) 233
بی بی انور ادھا (متحدہ عرب امارات) 237
غزالہ یاسمین (کراچی) 241

جواد فرخ (جدہ، سعودی عرب) 243
مبارک الٰہی (اسلام آباد) 246
بنتِ حوا 250
ج-ب (اسکاٹ لینڈ) 252

دیباچہ

خانوادہ سلسلہ عظیمیہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے کتاب تذکرہ قلندر باباولیاء میں تحریر فرمایاہے کہ قدرت اپنے پیغام کو پہنچانے کے لیے دیے سے دیاجلاتی رہتی ہے معرفت کی مشعل ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔آخر یہ قطب، غوث، ولی، ابدال، صوفی، مجذوب اور قلندر سب کیاہیں۔ یہ قدرت کے وہ ہاتھ ہیں جو روحانی روشنی کی مشعل کو لے کر چلتے رہتے ہیں۔اس روشنی سے اپنی ذات کو بھی روشن رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی روشنی کاانعکاس دیتے ہیں۔اور جس کو اپنے اس فیض سے مالامال کرتے ہیں اس کادست حق پرست معرفت اور باب معرفت کے مرکزاور شہر حضرت مولا علی مشکل کشار ضی اللہ عنہ سے ملادیتے ہیں جو دربار رسالت ﷺ میں اس عقیدت کو پیش کرنے اور نذر گزارنے میں ہمہ وقت مصروف نیاز ہیں۔

صرف تاریخ کے اوراق نہیں بلکہ لوگوں کے دلوں پر ان بزرگوں کی ایسی ایسی داستانیں اور چشم دید باتیں اب تک زندہ اور محفوظ ہیں جن کی دعاؤں سے مردوں کو زندگی، بیماروں کو شفا، بھوکوں کو غذا، دکھیوں کو عطا، غریبوں کو زر، بے حال لوگوں کو بال وپر، بے سہارااور بے کس لوگوں کو اولاد اور مال ومتاع کے انعامات ملتے رہتے ہیں۔

عظیمی صاحب نے امام سلسلہ عظیمیہ محمد عظیم برخیاءالمعروف قلندر باباولیاکے حوالہ سے کتاب میں تحریر فرمایاہے کہ

ابدال حق قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آسمان علم وآگاہی میں ایک ایسادرخشندہ ستارہ ہیں جن کے بارے میں حضور اکرامؐ کاارشاد ہے۔۔۔۔

میں اپنے بعد اللہ کی کتاب اور اپنی اولاد چھوڑ کر جارہاہوں۔

کتاب تذکرہ قلندر باباولیاء میں باباصاحب رحمتہ اللہ علیہ کے شامل اشاعت مکتوبات میں سے ایک خط جوآپ نے ایک صاحب کے استفسارات کے جواب میں تحریر کروایاتھا قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش خدمت ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادر عزیز سلمہٗ اللہ تعالیٰ سے بہت دعا۔

حسب ذیل عبارت تمہارے تحریر کردہ سوالات کے جواب میں لکھی جارہی ہے۔بظاہر سوالات بالکل مختصر اور آسان ہیں لیکن ان کا جواب زیادہ غور طلب ہے اور تفصیل چاہتا ہے۔اگر پوری باتیں سمجھنے میں دقت پیش آئے تو بار بار پڑھ کے اور غور کر کے الفاظ کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ۔یہ ایسی باتیں ہیں جن کا صرف کاغذ پر لکھا رہنا کافی نہیں ہے۔ان کا حافظہ میں نقش کرنا ضروری ہے۔

لوح محفوظ سے ایک نور آتا ہے وہ اس طرح پھیلتا ہے کہ ساری کائنات اس کی گرفت میں ہوتی ہے۔اس کے پھیلنے کی طرزیں کسی ایک سمت میں نہیں ہوتیں بلکہ ہر سمت میں ہوتی ہیں۔

اسی بات کو دوسرے الفاظ میں اس طرح کہیں گے کہ اس نور کے پھیلنے کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔اب تم سمت نہ ہونے کا مطلب سمجھ لو کہ سمت نہ ہونا کیا چیز ہے اور نور کا تمام سمتوں میں پھیلنا کیا معنی رکھتا ہے۔یہ ساری باتیں قرآن پاک میں بالتصریح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہیں۔افسوس یہ ہے کہ ان ارشادات کو متشابہات کہہ کر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

تحریر میں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔صرف ایک مثال دے کر میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔اس مثال پر غور کرو۔چند خلا باز خلا میں جا چکے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ

- ۱۰۰ میل سے زیادہ بلندی پر ایک تو بالکل بے وزنی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔
- دوسرے یہ کہ زمین یا تو بالکل گول یا تقریباً گول نظر آتی ہے۔
- ایک نے کہا ہے کہ گیند نما نظر آتی ہے۔تم نے خود بھی مشاہدہ میں دیکھا ہے کہ پپیتہ کی صورت ہے۔

اب صحیح صورت حال سمجھنا چاہو تو یہ نظر آئے گا یا یہ محسوس ہو گا یا یہ حقیقت منکشف ہو گی کہ ساڑھے تین ارب انسان اور چلنے پھرنے والے چوپائے سب کے سب ٹانگوں کے بل زمین سے لٹکے ہوئے ہیں۔ہر انسان یہ کہتا ہے کہ میں زمین پر پیروں کے بل چل رہا ہوں۔ سمجھ لو کہ وہ کتنی غلط بات کہہ رہا ہے۔جب سے نوع انسانی آباد ہے،وہ تمام لوگ جن پر حقیقت منکشف نہیں ہوئی ہے یہی کہتے ہیں۔یہی سمجھتے ہیں۔

غور کرو کہ جب آدمی پیروں کے بل لٹک رہا ہے تو چل کیسے سکتا ہے۔لٹکنے کی حالت تو بالکل جبری ہے۔اس کا یہ کہنا کہ میں چل رہا ہوں سراسر غلط ہے۔جبری حالت میں اسکا ارادہ بے معنی ہے۔اس لئے کہ اس کی اپنی کوئی حرکت ممکن نہیں۔

یہ بات تو قرین قیاس ہے کہ جن تاروں میں اسکے پیر بندھے ہوئے ہیں وہ تار حرکت کرتے ہوں اور ان کے ساتھ پیر بھی حرکت کرتے ہوں ۔ان تاروں سے انسان کے ارادے کا کیا تعلق جب کہ انسان کو ان تاروں کا کوئی علم ہی نہیں۔باوجود اتنی صریح غلطیوں کے وہ دعوے کرتا ہے کہ میرا سر بلندی کی طرف ہے،اور میرے پیر پستی کی طرف اور میں چلتا پھرتا ہوں۔واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو ایک بنوالیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بنوا حقیقت

ہے۔دراصل نہ کوئی سمت ہے،نہ انسان حرکت کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ہاں صرف نیت کر سکتا ہے۔چناچہ اس نے اپنی نیت ہی میں لاشمار دعوے جمع کر لئے۔انسان کے باقی تمام دعوؤں کا اس ہی دعوے پر قیاس کر لو۔اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ہر مشاہدہ کو رد کیا ہے۔جگہ جگہ فرمایا ہے۔

تم نہیں سمجھتے ایسا ہے،ایسا ہے اور تم نہیں دیکھتے۔

ایک جگہ فرمایا ہے۔

تم دیکھتے ہو پہاڑ اور گمان کرتے ہو کہ یہ جم رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو قرآن پاک میں غیب فرمایا ہے وہ انسان کا غیب ہے،اللہ کا غیب نہیں ہے۔ظاہر ہے کہ جب وہ اللہ کے لئے غیب نہیں ہے تو اللہ کے لئے حضور ہے۔جو اللہ کا حضور ہے وہ حقیقت ہے جو انسان پر منکشف نہیں ہے۔اس لئے جو اس کا مشاہدہ ہے وہ حقیقت نہیں ہے،اس ہی لئے غلط ہے۔ بدیں سبب ہر مشاہدہ کو رد کیا ہے۔اب ساری حقیقت علم حضوری ہے۔یہ علم حضوری اللہ کی طرف سے ملتا ہے،جس کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔قرآن پاک میں اس کی بھی وضاحت ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

جس نے ہمارے لئے جہد کیا ہے،ہم اس پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔العنکبوت:آیت ۶۹

قرآن پاک میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ملکۂ سبا کے قصے میں ہے

جب سلیمان علیہ السلام نے کہا اپنے درباریوں سے کہ تم میں کون اس کا تخت جلدی لا سکتا ہے تو
جنات میں سے ایک نے کہا کہ جتنی دیر میں آپ دربار برخاست کریں،میں تخت حاضر کر دوں گا۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ایک دوسرے شخص نے کہا پلک جھپکنے بھی نہ پائے گی کہ تخت
یہاں موجود ہو گا۔۔۔اور تخت آگیا۔النمل:۴۰

اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی خصوصیت بتائی ہے کہ وہ کتاب کا علم رکھتا تھا۔جتنے صحائف آسمانی ہیں،اللہ تعالیٰ ان سب کو کتاب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ان میں قرآن بھی ہے۔چناچہ قرآن میں یہ علم موجود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے اور بار بار قرآن کو کتاب کے نام سے موسوم کیا ہے ۔جو قرآن نہیں سمجھتے وہ جو بھی چاہیں کہیں،ان کی زبان کون پکڑ سکتا ہے لیکن قرآن خود ان کی تردید کرتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ تم عربی پڑھو اور قرآن کو قرآن کے الفاظ میں سمجھو۔بغیر کسی تاویل اور بغیر کسی اثر کے بالکل غیر جانب دار ہو کر،اس تصور سے کہ اللہ تعالیٰ کیا فرماتے ہیں۔جہاں تک سمجھنے کا سوال ہے،اللہ تعالیٰ نے خود وعدہ فرمایا ہے کہ

میں نے تمہارے لئے قرآن کا سمجھنا آسان کر دیا ہے

--------ہے کوئی سمجھنے والا--------

یہ صلائے عام ہے۔ سورہ قمر میں چار مرتبہ یہ بات کہی گئی ہے۔

آمدم بر سر مطلب۔ تم یہ بات سمجھ گئے ہو گے کہ سمت کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ انسان کی اپنی مفروضہ اور قیاس کردہ ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے علم حضوری کے علاوہ کوئی علم موجود نہیں ہے۔ انسان کا حافظہ اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ علم حضوری کی کسی ایک طرز کو بھی اپنے اندر محفوظ کر لے۔ چنانچہ لوح محفوظ سے پھیلنے والا نور انسان کو اطلاعات فراہم کرتا ہے تو اپنی غرض اور مطلب برآری کے نقطۂ نظر سے کام لے کر ان اطلاعات کا ۹۹۹ فی ہزار تورد کر دیتا ہے۔ ایک فی ہزار کو مسخ کر کے توڑ مروڑ کے حافظہ میں رکھ لیتا ہے۔ یہی مسخ شدہ اور بگڑے ہوئے خدوخال، اس کے تجربات کا، مشاہدات کا، عادات اور حرکات کا سانچہ بن جاتے ہیں۔ اب جتنی اطلاعات وہ اخذ کرتا ہے، ان ہی سانچوں میں ڈھلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ ہے انسان کا تمام کارنامہ اور اس کی معین کردہ اور فرض کردہ سمتیں، فارمولے اور اصول۔ اس ہی خرافات کے بارے میں وہ بار بار یہ کہتا رہتا ہے کہ یہ ہے میرا تجربہ، یہ ہے مشاہدہ، یہ ہے علم طبیعی۔

تمہارے ذہن میں یہ بات تو آگئی کہ

جو نور پوری کائنات میں پھیلتا ہے اس میں ہر قسم کی اطلاعات ہوتی ہیں جو کائنات کے ذرہ ذرہ کو ملتی ہیں۔ ان اطلاعات میں چکنا، سونگھنا، سننا، دیکھنا، محسوس کرنا، خیال کرنا، وہم و گمان وغیرہ وغیرہ زندگی کا ہر شعبہ، ہر حرکت، ہر کیفیت کامل طرزوں کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔

ان کو صحیح حالت میں وصول کرنے کا طریقہ صرف ایک ہے۔ انسان ہر طرز میں، ہر معاملہ میں، ہر حالت میں کامل استغنیٰ رکھتا ہو۔۔۔ مسخ کرنیوالی اس کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ جہاں مصلحت نہیں ہے، وہاں استغنیٰ ہے، غیر جانبداری ہے اور اللہ کا شعار ہے۔ اب جو حرکت ہوتی ہے وہ پوری کائنات پر محیط ہے اور پوری کائنات میں عمل کرتی ہے۔

اس چیز کو پھر ایک دفعہ سمجھ لو۔ یہ کوئی باریک بات نہیں ہے۔ صرف توجہ کی ضرورت ہے۔ انسان کی ذاتی مصلحتیں اپنے لئے نور کی شعاعوں کو محدود کر لیتی ہیں۔ یہ محدود شعاعیں اپنا کائناتی عمل ترک نہیں کر سکتیں، وہ تو جاری رہتا ہے۔ اب انسان کا ایک باطل تصور جو اس نے شعاعوں سے وابستہ کر لیا ہے، غلط امیدیں بن جاتا ہے۔ یہی ناکامی ہے۔ یہی انسانی مصیبت ہے۔ سیدھی سادی بات ہے کہ جس نور کا تعلق ساری کائنات سے ہے وہ ایک فرد واحد کے لئے کیسے مخصوص ہو سکتا ہے۔ انسان اگر ذاتی اغراض کی قید و بند میں مبتلا نہیں ہے تو ان شعاعوں کو پوری کائنات پر محیط دیکھتا اور محیط سمجھتا ہے۔ چنانچہ شعاعوں کا اور اس کے زاویہ نظر کا ایک خاص ارتباط قائم ہو جاتا ہے۔ یہ ارتباط وہ شے ہے جو اللہ کے قانون کے زیر اثر شعاعوں کے لئے محل توجہ ہے۔ اب اس کے مفاد کا تحفظ شعاعیں خود کرتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر وہ کہے دن تو شعاعوں کو دن پیدا کرنا پڑے گا۔ اگر وہ کہے رات

توشعاعوں کورات کی تخلیق کرنی پڑے گی۔اللہ کا شعار شعاعوں کواس بات کا حکم دیتا ہے کہ وہ دو سنتیں پوری کریں۔۔۔۔ایک کائنات کے لئے عمل کرنا،دوسری اس فرد کے مفاد میں عمل کرنا جس نے ان شعاعوں سے ارتباط قائم کیا ہے۔

جس وقت حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے درخواست کی تھی کہ آپ مجھے کچھ نصیحت کریں۔اس پر حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے دو سوال کیے۔

ا۔یاعمر!آپ اللہ کو جانتے ہیں۔

انہوں نے جواب دیا۔ہاں میں اللہ کو جانتا ہوں۔

۲۔یاعمر!اللہ بھی آپ کو جانتا ہے۔۔۔۔

جواب دیا،اللہ بھی مجھے جانتا ہے۔

ان دونوں باتوں کا مطلب بالکل واضح ہے۔صرف یہ کافی نہیں ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں قدم اٹھائے اور کام پورا ہو جائے۔وہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قدم صرف اللہ کے لئے اٹھایا گیا ہے یا اور بھی مصلحتیں شامل ہیں۔اس میں جنت بھی ایک مصلحت ہے۔اور بہت سی نیکیاں بھی مصلحت ہیں۔اللہ تعالیٰ کسی کو اس وقت تک نہیں پہچانتا جب تک کہ مقصد صرف اللہ کی ذات نہ ہو۔اگر ایک آدمی کا مقصد جنت ہے تو جنت اسے جانتی ہے۔کہتی ہے "آؤلبیک"

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ روحانیت میں اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا مقصد،کوئی دوسری غایت شریک کرنا کفر ہے۔

تم نے جو خواب لکھا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

میں آپ کے قدموں میں بیٹھا رو رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ باباجی!میری اماں کہاں گئی۔میری اماں مجھے دلا دو۔

اطلاع کے تین حصے ہیں۔ایک حصہ میری صورت ہے۔دوسرا حصہ تمہاری اپنی صورت ہے۔تیسرا حصہ اماں ہیں جو موجود نہیں ہیں۔اطلاع کا انکشاف ہوتا ہے یہاں سے کہ تم ایک جگہ ہو۔اس جگہ تمہاری حیثیت ایک ایسے سوال کی ہے جو بہت سے سوالات کا مجموعہ ہے۔اس مجموعہ کا نام ہے اماں یعنی زندگی کے بہت سے راستے جس نقطہ سے شروع ہوتے ہیں اور انسان یہ طے نہیں کر سکتا کہ مجھے کن راستوں پر سفر کرنا ہے۔قدرتاًں کی پوزیشن یہی ہے کہ وہ زندگی کو ایک ایسے نقطے پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے جہاں سے زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔راستے لاشمار ہیں،انسان کے سامنے یہ مرحلہ ہے کہ وہ جس راستہ پر سفر شروع کرے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ راستہ غلط ثابت ہو جائے اور اسے ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے۔

یہاں وہ اپنی روح سے رہنمائی چاہتا ہے لیکن روح کو کسی روپ میں متشکل دیکھتا ہے کیوں کہ اسے ہر شے کو مشہود بنا کے دیکھنے کی عادت ہے۔ جن دنوں میں تم نے یہ خواب دیکھا ہے، ان دنوں میں ایسے خیالات کا زیادہ زور اور دباؤ رہا ہے۔ مذکورہ بالا خواب ۱۹ جون کا ہے۔ ذہن پر کیفیت ہفتوں پہلے سے مسلط تھی۔ اس کا جواب روح سات جون کو خواب میں دے چکی ہے۔ سات جون کا خواب تم نے اپنے الفاظ میں اس طرح دیکھا ہے۔

ایک آدمی نے مجھے آ کے کہا کہ قبلہ بدر صاحب نے تم کو بلایا ہے۔ میں فوراً روانہ ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک مکان میں داخل ہو گیا۔ دروازہ پر ایک عورت ملی۔ اس عورت نے کہا کہ بدر صاحب اس کمرے میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ کمرے میں داخل ہو کر میں نے دیکھا کہ بدر صاحب میز کے سامنے بیٹھے ہوئے کچھ کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ میں نے سلام عرض کیا۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور میری زبان اپنے منہ میں لے کر زور سے دبائی جس سے میری آنکھ کھل گئی۔

اس خواب میں مذکورہ سوالات کا پورا جواب موجود ہے۔ یعنی مستقبل میں اللہ کی طرف سے معاونت کا بندوبست ہو گا۔ غیب سے ایسا پروگرام بن جائے گا جو آئندہ زندگی کو کامیاب بنانے کا ضامن ہے۔ ہر چیز بروقت ہوتی جائے گی۔ واضح طور پر اس خواب میں سب چیزیں موجود ہیں۔۔۔ تمہارا بلایا جانا، درمیان میں کسی کی رہنمائی اور آخری منزل میں انسپائریشن (الہامی خیال، Inspiration) کی تکمیل غیب ہے۔ یہ سارے ذرات خواب میں الگ الگ موجود ہیں۔ دنیا کے معاملات باقی رہے، وہ سارے کے سارے ان ہی کڑیوں کا ساز و سامان ہیں۔ ان کا بروقت موجود ہونا، عمل میں آنا یقینی ہے۔

تم نے حسب ذیل مراقبہ لکھا ہے۔

۱۔ رات کو سبق پڑھتے ہوئے سارا جسم زمین سے اٹھ جاتا ہے۔ مگر جب آگے چلنے کی کوشش کرتا ہوں تو گرنے لگتا ہوں۔

۲۔ جب آپ کا تصور کرتا ہوں تو آپ اور ناظم آباد کا پورا مکان میرے سامنے ہوتا ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ناظم آباد میں ہوں یا ناظم آباد اور میرے پاس آ گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (2) الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ۔ البقرہ ۲ تا ۳

مفہوم: یہ کتاب ان لوگوں کو روشنی دکھاتی ہے جو اپنے اندر اللہ کے بارے میں ذوق رکھتے ہیں۔

غیب سے مراد وہ تمام حقائق ہیں جو انسان کے مشاہدات سے باہر ہیں۔ وہ سب کے سب اللہ کی معرفت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایمان سے مراد ذوق ہے۔ ذوق وہ عادت ہے جو تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ اسے کوئی معاوضہ ملے گا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ طبیعت کا تقاضہ پورا کرے۔

متقی سے وہ انسان مراد ہے جو سمجھنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے۔ ساتھ ہی بد گمانی کو راہ
نہیں دیتا۔ وہ اللہ کے معاملے میں اتنا محتاط ہوتا ہے کہ کائنات کا کوئی روپ اسے دھوکا نہیں
دے سکتا۔ وہ اللہ کو بالکل الگ سے پہچانتا ہے اور اللہ کے کاموں کو بالکل الگ سے جانتا ہے۔

صحیح طور سے پہنچاننے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر ذوق موجود ہے۔

یہ نہ سمجھ لینا کہ ہر انسان کے اندر یہ ذوق موجود نہیں ہے۔ در حقیقت وہی ذوق لائف اسٹریم (چشمۂ حیات Life Steam) ہے۔ اس ہی زندگی کی بنا ہے۔ انسان اس کو استعمال کرے یا نہ کرے یہ اس کی اپنی مرضی اور مصلحت ہے۔ یہ ذوق ہی انسان کے اندر بستا ہے ورنہ انسان خلا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد کیا ہے

میں نے انسان کو بجنی مٹی سے بنایا ہے۔

یہاں مٹی کی نیچر (فطرت Nature) بیان کی ہے جو خلا ہے۔ اب یہ بات تمہارے لئے سمجھنا بہت آسان ہے کہ ذوق میں نہ وزن ہوتا ہے، نہ ذوق کے لئے فاصلہ کوئی معنی رکھتا ہے۔ نہ ذوق زمین آسمان کی حدود کا پابند ہے۔ نہ اسے وقت پابند بنا سکتا ہے۔ یہی ذوق چلتا پھرتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ انسان اس سے اس وقت تک متعارف نہیں ہوتا جب تک اس سے تعارف حاصل نہ کرے۔ جب تعارف حاصل کر لیتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہی ذوق انسان ہے۔ یہ پوری کائنات میں آزاد ہے۔ فرشتوں کا سربراہ ہے۔ اللہ کی بہترین صنعت ہے اور کائنات میں اللہ کا نائب ہے۔ نہ وہ پیروں سے چلنے اور ہاتھوں سے پکڑنے کا پابند ہے۔ نہ وہ آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کا محتاج ہے۔ یہ ساری خرافات انسان نے آپ ہی تخلیق کی ہیں اور آپ ہی ڈھول بجاتا پھرتا ہے کہ ہائے میں تو بالکل مجبور ہوں۔

تم یہ سوچو گے کہ کتنے ہی آدمی جو اللہ تعالیٰ سے تعارف حاصل کر سکے وہ تو بہر صورت آزاد نہیں ہیں۔ انہیں ہر معاملہ میں آزاد ہونا چاہیے۔

یہ صحیح ہے کہ وہ آزاد ہیں مگر ساتھ ہی وہ نوع انسانی کے معاشرے کی رسی میں بندھے
ہوئے ہیں۔ ہر دور میں اس ہی کمزوری نے ایسے لوگوں کی آزادی کو ادھورا رکھا ہے۔

جس کا نام زید ہے وہ اس ہی ذوق کا پٹرن (طرز Pattern) ہے۔ کوئی پیٹرن ساکت و صامت پنجرہ نہیں بلکہ بولتا، چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، سوچتا سمجھتا انسان ہے۔ فرش سے عرش تک اس کا ایک قدم ہے۔ سوئی کا روزن اور آسمانوں کی کھلی فضا ایک ستارہ سے دوسرے ستارے تک کا فاصلہ اس کے لئے ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ وہ نہ کہیں رکتا ہے، نہ کھٹکتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ وہ خود کو جانتا نہیں کہ میں کیا ہوں اور کائنات کیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نوع انسانی پر یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ان تمام رازوں کو واشگاف کر کے رکھ دیا۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ سب راز انہوں نے از خود منکشف کر دیئے تھے بلکہ ان پر اللہ نے کھولے جن کو من و عن انہوں نے قرآن کی صورت میں ریکارڈ کرا دیا۔ انہوں نے ساری زندگی کی جفاکشی سہہ کر

اس امانت کو نوع انسانی کے حوالے کیا۔ نوع انسانی نے جو قدر کی ہے، وہ ظاہر ہے۔ اللہ نے اس ہی علم کو کتاب کا علم فرمایا ہے۔ ہر انسان اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، چاہے اس کا نام زید ہو، بکر ہو یا عمر ہو۔

تم نے لکھا ہے کہ چلنے کی کوشش کرتا ہوں تو گرنے لگتا ہوں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ابھی تم انسان سے اچھی طرح متعارف نہیں ہو جو حقیقی انسان ہے۔ تم یہ خط بغور پڑھنا۔ اگر کوئی لفظ یا طرز بیان تمہیں مشکل محسوس ہو اسے بار بار پڑھ کر سمجھ لینا۔ رات کے وقت فرصت بیٹھ کر حرف بحرف اس خط کی نقل کرنا اور وہ نقل اپنی فائل میں محفوظ کر لینا۔ اس خط کی نقل کرنا تمہارے لئے اشد ضروری ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عبارتیں اور مفہوم اچھی طرح تمہارے حافظہ میں منتقل ہو جائیں۔ پھر اس نقل کا بار بار پڑھنا بھی ضروری ہے۔ جب تم اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کو بار بار پڑھنے میں آسانی محسوس کرو گے اور ذہن کو لفظوں کے معانی میں مرکوز رکھ سکو گے، میرے لکھے ہوئے لفظوں کو پڑھنے میں ذہن پر الگ سے جو بار پڑ سکتا ہے اس بار سے تمہارا ذہن محفوظ رہے گا۔

سلسلہ کے سب بہن بھائی تمہیں یاد کرتے ہیں اور مزاج پوچھتے ہیں۔

بہت یاد سے

دعا گو

حسن اخریٰ محمد عظیم

ایجے شب، ۱۹ اگست، ۱۹۶۳ء

عظیمی صاحب نے حضور قلندر باباولیاء کی پیروی میں لاتعداد خطوط تحریر فرمائے ہیں۔آپ مختلف حالات سے ہوتے ہوئے تحریر کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ جس کی ابتداء معاش کے حصول کے دوران ۱۹۶۸ء میں حورمارکیٹ، ناظم آباد، کراچی میں کرایہ کی ایک دکان میں پرانے کوٹ اور سویٹروں کے کام سے شروع ہوئی جس میں فارغ اوقات میں آپ مختلف کتب کا مطالعہ فرماتے تھے۔ مطالعہ کے ذوق کے ساتھ ساتھ کتابوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ دکان میں کپڑے کم ہوگئے اور چند ہفتوں میں دکان ایک چھوٹی سی لائبریری بن گئی۔

ایک دن عظیمی صاحب نے "عالم تمام حلقہ دام خیال ہے" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر فرمایا۔اس زمانے میں آپ کے ایک عزیز روزنامہ ڈان میں ایڈیٹر تھے۔انہوں نے جب یہ مضمون دیکھا تو انہوں نے فرہاد زیدی صاحب (ایڈیٹر روزنامہ حریت) سے اخبار میں اس مضمون کی اشاعت کے لئے بات کی۔ دوران ملاقات فرہاد زیدی صاحب نے عظیمی صاحب سے استفسار کیا کہ اخبار میں آپ کس موضوع پر کالم لکھیں گے۔آپ نے بتایا کہ آپ پیراسائیکالوجی پر کالم تحریر کرنا چاہتے ہیں۔

فرہاد زیدی صاحب نے کہا کہ کالم شروع کرنے سے پہلے آپ کا امتحان لیں گے۔ وہ اس طرح کہ آپ فزکس، سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی کی ۱۲ سطروں میں وضاحت کردیں کہ یہ کیا ہیں۔ جب عظیمی صاحب نے تحریر کرنا شروع کیا تو ۹ سطروں میں بات مکمل ہوگئی۔آپ پریشان ہوگئے کہ مجھے فیل کردیا جائے گا۔آپ کے قلم کو رکا ہوا دیکھ کر فرہاد زیدی صاحب نے ازراہ مذاق کہا، عظیمی صاحب! کیوں پریشان ہیں، کیا دماغ نہیں چل رہا۔آپ نے فرمایا

جی! دماغ چل کے رک گیا۔۔۔۔۔آپ نے ۱۲ سطروں میں لکھنے کو کہا تھا، یہ تو ۹ سطروں میں بات مکمل ہوگئی۔

فرہاد زیدی صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا، یہ تو اور زیادہ اچھا ہوگیا۔ عظیمی صاحب نے فرمایا۔۔۔تو پھر تحریر دیکھ لیں۔آپ نے تحریر فرمایا تھا

فزکس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زندگی میں جو کچھ اس کے جذبات، احساسات کا تعلق ہوتا ہے اسے طبیعات کہتے ہیں۔ وہ جو کچھ اپنی زندگی میں کررہا ہے، نشیب و فراز سے گزر رہا ہے، اس نشیب و فراز سے گزرنے میں اس کے ذہن میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ کبھی خوش ہوتا ہے، کبھی غمگیں ہوتا ہے اور اس کا کچھ فیصلہ نہیں کرسکتا ہے، اسے نفسیات کہتے ہیں۔
فزکس اور نفسیات کے مسائل کو جو چیز حل کررہی ہے، جہاں سے مسائل آرہے ہیں، اسے پیراسائیکالوجی کہتے ہیں۔

فرہاد صاحب نے تحریر پڑھنے کے بعد کہا آپ کا اس ہفتہ سے کالم چھپے گا۔

اٹھتے اٹھتے فرہاد زیدی صاحب نے پوچھا کہ آپ مضمون کیسے لکھتے ہیں، مضمون کی آمد کا سلسلہ کیسے ہوتا ہے، کیا آپ پہلے کوئی پلان بناتے ہیں، کیا آپ مضمون لکھنے سے پہلے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ سوال عظیمی صاحب کے لئے حیرت کا باعث بنا، اس لئے کہ انٹرویو کے وقت آپ کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ آپ کا امتحان کس طرح ہوگا۔ آپ سے لکھنے کو کہا گیا، آپ نے اللہ سے دعا کی اور لکھنا شروع کر دیا۔ جو مضمون ۱۲ سطروں میں لکھنے کے لئے کہا گیا تھا وہ ۹ سطروں میں پورا ہو گیا۔

قصہ کوتاہ عظیمی صاحب نے عرض کیا کہ

فرہاد صاحب! میرے دماغ میں ایک خیال آتا ہے۔ وہ خیال پھلجھڑی کے پھولوں کی طرح
دماغ کی اسکرین پر پھیل جاتا ہے۔ میں ان پھولوں کو چن کر ایک لڑی میں پرو دیتا ہوں، وہ
لڑی جملے بن جاتی ہے، جملوں سے پیرا بن جاتا ہے اور پیرے سے مضمون بن جاتا ہے۔

فرہاد زیدی صاحب بولے! اگر آپ کے ذہن میں خیال نہیں آیا تو ہم آپ کے مضمون کے انتظار میں بیٹھے رہیں گے۔ کاپی لیٹ ہو جائے گی۔
۔۔ بات ہنسی مذاق میں گزر گئی۔ آپ خوشی خوشی مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے، ساری روئداد آپ کے گوش گزار کی۔۔
حضور قلندر بابا اولیاء مسکرائے اور فرمایا۔

خواجہ صاحب! آپ ساری عمر لکھتے رہیں گے اور

ہر مضمون تھیم (Theme) ایک ہونے کے باوجود نیا ہوگا۔

آپ کے اوپر اللہ کا فضل سایہ فگن ہے۔

اور اس طرح ۱۹۶۹ء میں روزنامہ حریت سے باقاعدہ نشر و اشاعت کا آغاز ہوا۔

قارئین نے سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی کے ان مضامین کو نا صرف پسند کیا بلکہ اپنے مسائل کے حل کے لیے خطوط بھی لکھنے شروع کر دیئے جن میں زیادہ تر خطوط خواب کے متعلق ہوتے تھے۔ شروع کے دنوں میں ہفتہ میں تین یا چار خط موصول ہوتے تھے اور پھر یہ سلسلہ ہر ہفتہ سینکڑوں خطوط پر پھیل گیا۔

حریت کے بعد نومبر ۱۹۷۱ء میں روزنامہ جسارت میں آپ کے کالم کا آغاز ہوا۔ اب تک جن اخبارات و جرائد میں آپ کے کالم شامل اشاعت ہوتے رہے ہیں ان کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

ا۔ روزنامہ حریت

۲۔روزنامہ جسارت

۳۔روزنامہ ملت (گجراتی)

۴۔روزمانہ مشرق

۵۔روزنامہ اعلان

۶۔روزنامہ جنگ۔کراچی

۷۔روزنامہ جنگ۔لندن

۹۔ماہنامہ مشعل ڈائجسٹ

۱۰۔ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ

آپ نے ان اخبارات و جرائد میں عوام کے ان گنت معاشی، معاشرتی، نفسیاتی مسائل اور الجھنوں کا حل پیش کیا ہے اور مظاہر قدرت کے پیچیدہ معموں سے متعلق سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔

۲۰۰۸ کے محتاط اعداد و شمار کے مطابق مرکزی مراقبہ ہال میں مسائل کے حل کے لئے موصول ہونے والے خطوط کی تعداد کم و بیش نو ہزار خطوط ماہانہ تھی۔تادم تحریر آج بھی عظیمی صاحب انتہائی مصروفیات کے باوجود اپنی ڈاک خود دیکھتے ہیں۔بعض اوقات باوجود کوشش کے خط کے جواب میں تاخیر ہو جاتی ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ نے کسی خط کو جواب دیئے بغیر تلف کر دیا ہو۔

عظیمی صاحب کے بیشتر مکتوبات رسمی تمہیدی اور مروجہ اختتامی کلمات سے عاری ہیں۔آپ خط میں فوری طور پر ہی اس مقصد، موضوع اور مسئلہ کے بیان پر آجاتے ہیں جو خط لکھنے کا محرک بنا تھا۔

آپ خط کے ایسے سادہ اور فطری انداز مکالمت میں تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کی تحریر براہ راست دل پر اثر کرتی ہے۔آپ کے مکتوبات اپنے مندرجات کی بناء پر ایک ایسا آئینہ ہیں جن میں ان مکتوبات کا مطالعہ کرنے والا نہ صرف مکتوبات نگار بلکہ مکتوب الیہ کے کردار، شخصیت اور ذہنی رجحان کا عکس بھی دیکھ لیتا ہے۔

عظیمی صاحب کے مکتوبات کی ایک بڑی تعداد اخبارات، رسائل اور نجی ذخائر میں موجود ہے یا پھر دست برد زمانہ کے ہاتھوں تلف یا ضائع ہو چکی ہے۔دستیاب مکتوبات میں سے چند کا انتخاب صحیح معنوں میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔عظیمی صاحب کے مکتوبات کا یہ مجموعہ

موضوعات کے اعتبار سے متنوع ہے۔ اگرچہ یہ خطوط اشاعت کے مقاصد سے نہیں لکھے گئے لیکن جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں وہ مطالعۂ عام کے موضوعات بھی ہیں۔

اجتماعی اور انفرادی تربیت کے لئے آپ کے لکھے ہوئے مکتوبات ایسی بارش ہے جو روحانی پیاسوں اور متلاشیان حقیقت کو ابد تک سیراب کرتی رہے گی۔

شعبہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی کے کارکنان کے لئے یہ امر باعث مسرت ہے کہ انہیں حضور مرشد کریم کے مکاتیب کی تحقیق و تلاش کی خدمت انجام دینے اور اس کاوش کو "فقیر کی ڈاک" کے عنوان سے بصد احترام و ادب پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

میں اپنی اہلیہ اور بچوں سمیت احباب کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے میری کوتاہیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے میری بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ میں بالخصوص اراکین سلسلہ عظیمیہ، نگراں مراقبہ ہالز، لائبریرین برائے عظیمیہ روحانی لائبریرز کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مرشد کریم کے حوالے سے معلومات کی فراہمی میں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

دنیا میں بہت کم مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کچھ کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی کی نظر کرم ہے کہ آپ نے مجھے یہ سعادت بخشی ہے کہ میں شعبہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی پر کام کر سکوں لہٰذا میں اس موقع پر اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ مجھے یہاں اور وہاں مرشد کریم کی رفاقت نصیب ہو۔ آمین

شہزاد احمد عظیمی

۲۷ جنوری ۲۰۲۰ء

آقا! آپ کے قدموں کی خاک میرے لئے پاکیزہ اور مقدس ہے..... میرے آقا! آپ کا مقام میری نظر میں اتنا اعلیٰ وارفع ہے جہاں میرے تصورات کی پرواز بھی ختم ہو جاتی ہے۔

میرے مولا! مجھ ایسے ہزاروں آپ پر سے قربان۔ آپ تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میرے دل کا سرور، میری مضطرب اور بے چین روح کا سہارا ہیں۔ آپ میرے لئے کیا ہیں..... میں اس کو بیان بھی نہیں کر سکتا۔ الفاظ کہاں ہیں میرے پاس..... میں اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں آپ کو محیط دیکھتا ہوں۔ آپ ہی تو ہیں کہ میری زندگی میں بہار ہی بہار ہے۔ آپ کی محبت..... آپ کا پیار..... آپ کی عنایت..... آپ کا کرم ہی تو میری حیات ہے۔

آپ کی جدائی کا احساس جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو دل رونے لگتا ہے، آنکھ پُرنم ہو جاتی ہے..... سینہ میں گھٹن ہونے لگتی ہے۔ بعض مرتبہ تو ایسا لگتا ہے کہ دل جل رہا ہے اور سینہ سے دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے خوب روؤں، آہ زاریاں کروں ..... روح ایک چیخ مارتی ہے اور وہ چیخ ابھی باہر نہیں آتی کہ آپ کا سراپا مجسم نور، مجسم رحمت و شفقت سامنے آجاتا ہے۔ بے قراری قرار میں بدل جاتی ہے اور بے حالی و درماندگی کی جگہ ایک عجب قسم کی خوشی اور مسرت لے لیتی ہے۔ طبیعت اتنی ہلکی اور لطیف ہو جاتی ہے کہ ماحول کی ہر چیز خوشی میں جھومتی اور گاتی نظر آتی ہے..... لیکن پھر وہی اضطراب، اضطراب، اضطراب..... دل ڈوبتا ہے۔ آنکھیں اشک ریز ہوتی ہیں۔ دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ ذہن زخمی پرندوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا ہے..... جسم شل ہو جاتا ہے..... ہاتھوں پیروں سے جان نکلنے لگتی ہے..... کن پٹیاں بجنے لگتی ہیں..... خاموشی مسلط ہو جاتی ہے۔ ایسے جیسے کوئی کسی گہری سوچ میں غرق ہو مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو۔

روح پھر چیخ مارتی ہے..... اور نور مطلق میں ڈھلا ہوا سراپا نظروں میں سما جاتا ہے..... پھر وہی خوشی، وہی سرور، وہی کیف..... جب سے حضور تشریف لے گئے ہیں آپ کا عاجز، ناپاک اور گناہ گار بندہ مستقلاً اس کھیل میں مصروف ہے۔

آپ کب تشریف لا رہے ہیں..... آپ کی صحت کیسی ہے..... آپ اپنے آرام کا ضرور خیال رکھئے۔ میں نے کئی مرتبہ یہ دیکھا ہے کہ آپ کی طبیعت بھاری ہے۔

برادر محترم مظفر صاحب کے خط سے آپ کی خیریت معلوم ہو گئی تھی۔

دلہن، فرخ، بی بی، بھائی جان، جمیل اور سلمیٰ، ڈاکٹر صاحب، جمال صاحب، بدر صاحب، رعنا اور ان کے بچے، نصرت اور ان کے بچے سب بخیر ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں۔

آپ کا غلام

احمد شمس الدین

۸، جون، ۱۹۶۲

کراچی

جناب ابراہیم جلیس صاحب

مکرم بندہ! السلام علیکم ورحمتہ اللہ علیہ

میں نے جب بھی آپ کے بارے میں سوچا ہے، مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ مجھ سے بہت قریب ہیں۔ایسا کیوں ہے..... بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ کو اللہ نے عوامی ذہن ودیعت کیا ہے۔

آپ کے کالم میں یہ پڑھ کر کہ آپ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کر رہے ہیں..... خوشی ہوئی۔اس سلسلہ میں چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں..... امید ہے کہ آپ اس پر توجہ دیں گے۔

اللہ کو معلوم ہے کہ مذہبی اعتبار سے ہماری موجودہ طرز فکر وسیع النظر مسلمانوں کے دلی تقاضوں.....اور طبعی رجحانات کو پورا کر رہی ہے..... یا اسلام سے دور لے جا رہی ہے..... اس دور میں اسلام صرف طہارت وغسل کے مسائل کا مرادف سمجھا جا رہا ہے اور یہ ہی تمام باتیں ہمیں ان مذہبی کتابوں میں ملتی ہیں جو تیسری صدی ہجری کے بعد فلسفہ ومنطق کی روشنی میں لکھی گئی ہیں..... حالانکہ قرآن پاک میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور معاشرتی مسائل سے متعلق تقریباً ڈیڑھ سو آیات ہیں جبکہ قرآن پاک میں سات سو چھپن آیتیں ہیں جن میں اللہ کی نشانیوں کی پوری پوری وضاحت ہے۔قرآن پاک میں اللہ کا ارشاد ہے۔

رات اور دن تمہارے طابع فرمان ہیں۔

سورج، چاند اور ستارے تمہارے محکوم ہیں۔

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب تمہاری

حاکمیت میں ہے۔

ہم نے انسان کو اپنی نیابت (خلافت) عطا فرمائی۔

ہم نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی۔وغیرہ وغیرہ۔

اللہ کا یہ تمام تخاطب انسان سے ہے۔ خلافت، حاکمیت اور اللہ کی اس روح کو جو انسان کے اندر پھونکی گئی ہے، کو پالینا ہی انسان کا وصف اور ورثہ ہے۔

میرا دل چاہتا ہے کہ آپ مذہبی کتابوں کا مطالعہ اس نہج سے کریں کہ مقصد حقیقی سامنے آجائے..... یہی وہ قدریں ہیں جن کو روحانیت کہا جاتا ہے۔

والسلام

آپ کا دوست

احمد شمس الدین عظیمی

۱۹، اکتوبر، ۱۹۶۵

کراچی

نام-نامعلوم

آپ نے اپنے عرفان نفس سے متعلق مضامین میں ابھی تک کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ قارئین کے اوپر یہ تاثر چھوڑنا چاہتے ہیں کہ آپ جو کچھ لکھ رہے ہیں۔اس کا آپ تجربہ رکھتے ہیں۔بندہ طالب علمی کے زمانے ہی سے نفسیات کا ذوق رکھتا ہے،مابعد النفسیات کو بھی میں نے پڑھا ہے لیکن وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو آپ لکھ رہے ہیں۔

آپ کی تحریروں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فرشتے،جنات اور غیب کا تعلق مابعد النفسیات سے ہے۔یہاں تک کہ آپ مضمون میں اس علم کو علم لدنی کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ایک مضمون میں آپ سرے سے ہی حواس کی حیثیت کو قبول نہیں کرتے۔نیز آپ خواب کو زندگی کا نصف قرار دے کر بیداری کو رد کرتے ہیں۔اس بیداری پر دنیا کی پوری تاریخ کا دارومدار ہے اور جس پر دنیا میں تمام رائج علوم کا انحصار ہے اور جس بیداری پر نوع انسان کی لاکھوں کروڑوں سال کی زندگی کا قیام ہے۔آپ کہتے ہیں کہ بیداری کے اندر جو حواس کام کرتے ہیں چونکہ وہ مفروضہ ہیں اس لئے بیداری بھی مفروضہ ہے۔

اس مرتبہ جنات کو آپ نے انسانوں سے زیادہ ہمدرد اور غم خوار کہہ کر انسان کی ذات پر حملہ کیا ہے بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ آپ نے اس مضمون میں انسان اور پوری انسانیت کی توہین کی ہے۔انسان جب اشرف المخلوقات ہے تو کسی بھی زاویہ یا عنوان سے اس کے علاوہ کوئی دوسری مخلوق اس میں چاہے فرشتے اور جنات ہی کیوں نہ ہوں،کیسے انسان سے برتر ہو سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ آپ عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔اگر میرا یہ خیال درست ہے تو میں آپ سے ملتجانہ درخواست کروں گا کہ ہماری قوم میں پہلے ہی پاگلوں کی کون سی کمی ہے جو آپ اس قسم کے مضامین لکھ کر پوری قوم کے حواس سے کھیلنا چاہتے ہیں۔

اگر آپ کو لکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اور بھی بہت سے موضوع ہیں جس سے قوم کے شعور میں جلا پیدا ہو سکتی ہے لیکن آپ سے کیا کہا جائے آپ تو شعور کو ہی مفروضہ کہتے ہیں۔میں پوچھتا ہوں جب شعور ہی نہیں رہے گا تو یہ سب جو ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں کس طرح نظر آئے گا۔لاکھوں سال میں انسان کی نوع نے جو ارتقائی منزلیں عبور کی ہیں ان سب کا کیا حشر ہو گا۔

اور میں آپ سے سوال کرتا ہوں،یہ جو مضمون آپ لکھتے ہیں اگر شعور ہی نہیں ہو گا تو کون پڑھے گا،کون سمجھے گا اور آپ کیسے لکھ دیں گے۔

(نام پتہ شائع نہ کریں)

عزیز بھائی، آپ کا خط شائع کیا جا رہا ہے۔ آپ نے اس خط میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ ہیں۔

۱۔ بیداری کے اندر جو حواس کام کرتے ہیں وہ سب کے سب مفروضہ نہیں ہیں

۲۔ خواب کو زندگی کا نصف حصہ قرار دینا عقل و شعور سے ثابت نہیں ہوتا

۳۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، وہ مابعد النفسیات کے علوم کا احاطہ نہیں کرتا

۴۔ مضمون میں جنات کو انسان سے زیادہ ہمدرد اور غم خوار کہہ کر انسانیت کی توہین کی گئی ہے

۵۔ میں عوام کو گمراہ کر رہا ہوں

۶۔ آپ نے ایک بہت ضروری بات یہ لکھی ہے کہ حریت میں مابعد النفسیات کے عنوان سے شائع ہونے والے مضامین پڑھ کر آپ تجسس کے عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں

ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں جو آپ نے تحریر کی ہیں۔ علم مابعد النفسیات میں ان علوم سے بحث کی جاتی ہے جو طبیعیات اور نفسیات کی نفی کرتے ہیں اور سب سے پہلے ہمیں یہ تلاش کرنا ہے کہ ہمارے اندر جو حواس کام کر رہے ہیں اور جن کو ہم بیداری کے حواس کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں وہ کس طرح بنتے ہیں اور ہمیں کہاں سے وصول ہو رہے ہیں۔ یاد رکھئے ہمارے اندر جو حواس کام کر رہے ہیں ان کا وجود مستقل نہیں ہے۔ ابھی ہم خوش ہو رہے ہیں اور پھر ناخوش ہو جاتے ہیں۔ ہم ہر قدم پر حواس کی گرفت میں اس طرح جکڑے اور بندھے ہوتے ہیں کہ ہماری اپنی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔

من حیث المجموع ہم کسی ایک تصور، کسی ایک خیال، کسی ایک احساس یا کسی ایک عمل کو خوشی اور راحت کا ذریعہ قرار نہیں دے سکتے۔ ایک خیال، ایک تصور یا عمل اگر میرے لئے خوشی اور راحت کا سبب ہے تو یہی عمل دوسرے فرد کے لئے انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے۔

اگر ایک شخص اولاد کی زیادتی سے پریشان اور بدحال ہے تو دوسرا شخص اولاد نہ ہونے کی وجہ سے مایوس اور ناامید ہے۔ اگر ایک آدمی افلاس اور تنگدستی سے عاجز آیا ہوا ہے تو دوسرا آدمی عیش و عشرت کے سامانوں کی کثرت سے دماغی کش مکش اور اعصابی کشیدگی میں مبتلا اور بے چین ہے۔ ایک آدمی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سکون کی دولت سے محروم ہے۔

جس کے پاس وسائل نہیں ہیں وہ اس لئے بے چین اور مضطرب ہے کہ اسے وسائل حاصل نہ ہونے کی شکایت ہے اور جس کے پاس وسائل کا انبار ہے وہ اس لئے بے چین اور مضطرب ہے کہ ان وسائل نے اس کی ذہنی آزادی کو سلب کر لیا ہے۔

کہا جاتا ہے دنیا میں سب سے زیادہ محبت ماں کو اولاد سے ہوتی ہے۔ مگر ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماں بھی اولاد کو بھول جاتی ہے۔ شوہر بیوی کو بھول جاتا ہے اور بیوی شوہر کی جدائی کو فراموش کر دیتی ہے۔ آج اگر ہمارے اوپر خوشی اور مسرت کے حواس غالب ہیں تو ہم غم واندوہ سے لبریز حواس کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ کبھی ہمارے اوپر مسلط ہی نہیں ہوئے تھے اور اگر آج ہمارے اوپر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں تو ہم اس زندگی، جس کو خوشیوں سے لبریز زندگی قرار دیتے ہیں اس طرح گزر جاتے ہیں کہ یاس اور ناامیدی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں۔

ان تمام حقائق کی موجودگی میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم بیداری کے جن حواس میں زندگی گزار رہے ہیں وہ مفروضہ نہیں ہے۔ یہ بات بہت غور طلب اور اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو پابند اور مقید پیدا نہیں کیا۔ قرآن پاک کے بیان کردہ قانون کی روشنی میں اصل انسان حواس کا پابند کبھی نہیں ہوا، حواس ہمیشہ انسان کے پابند رہے ہیں۔ آیئے یہ تلاش کریں کہ انسان کو حواس، سوچنا سمجھنا، متاثر ہونا، غم زدہ یا خوش ہونا، زندہ رہنے کی کوشش کرنا یا موت سے ہم آغوش ہو جانا کہاں سے ملے ہیں اور ان کی حیثیت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور جہاں سے

تمہارا دل چاہے خوش ہو کر کھاؤ پیو۔ تمہارے اوپر

زمانیت اور مکانیت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

لیکن دیکھنا اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم اپنے اوپر قید و بند کا عذاب مسلط کر لو گے۔

وہ درخت گندم کا درخت ہر گز نہیں ہے۔ وہ درخت ہے حواس کا، ایسے حواس کا جو انسان کو ہمیشہ پابند اور مقید رکھتے ہیں۔ درخت معنوی نقطۂ نظر سے ایک ایسی چیز کو کہا جاتا ہے کہ جس میں شاخ در شاخ پتے اور پھل کی موجودگی پائی جاتی ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اے آدم! زمان و مکان کی پابندی قبول نہ کرنا ورنہ تو اس میں اس طرح جکڑا جائے گا جس طرح کسی درخت میں شاخ میں سے شاخ اور پھر شاخ میں سے شاخ اور ہر شاخ میں بے شمار پتے ہوتے ہیں اور جب تو اس قید و بند کو آزادی کی اور خوشی کے بدلے قبول کرلے گا تو اپنے اوپر ظلم کرے گا۔

فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ O سورۃ بقرہ: ۳۵

اور جب آدم نے قید و بند کی زندگی کو اپنا لیا تو جنت نے (جو آزاد اور زماں اور مکان کی پابندیوں سے ماورا مقام ہے) اسے رد کر دیا چونکہ انسان جنت کے حواس کھو بیٹھا تھا جو اس کے اپنے اصل حواس ہیں۔ اس لئے انسان یا آدم کو زمین پر پھینک دیا گیا جہاں وہ پابندی اور قید و صعوبت کے حواس میں گرفتار ہے۔ علم مابعد النفسیات کا یہ کہنا ہے کہ زمین کے اوپر کام کرنے والے حواس مفروضہ ہیں۔ مبنی بر حقیقت ہے اس لئے کہ یہ انسان کے اصل حواس نہیں بلکہ عارضی اور نقلی ہیں۔ انسان کے اصلی حواس وہ ہیں جہاں اس پر زمان مکان کی حد بندیاں عائد نہیں ہوتیں۔ اگر انسان ان عارضی اور نقلی حواس کے تسلط سے نجات پا جائے تو پھر وہ اپنے اصلی اور آزاد حواس کو حاصل کر سکتا ہے جس میں نہ غم کا دخل ہے نہ پریشانی کو اور نہ جذبات کی کش مکش، اعصابی کشیدگی اور دل دماغ کے کرب کی داستانیں ہیں۔

عزیز بھائی! حریت میں شائع ہونے والے کسی مضمون میں بیداری اور، خواب کے حواس کی تشریح کی جا چکی ہے مختصراً پھر سن لیجئے۔ نوع انسان کی تاریخ میں ایسی ایک بھی مثال پیش نہیں کی جا سکتی کہ انسان بیداری اور سونے کی حالتوں میں سے کسی ایک حالت پر قدرت رکھتا ہو۔ انسان جس طرح سونے پر مجبور ہے بالکل اسی طرح بیداری بھی اس کی طبیعت کا ایسا تقاضا ہے جس کو وہ کسی صورت میں رد نہیں کر سکتا۔

بیداری کے اعمال و واقعات میں انسان کا دماغ جس طرح توہمات، خیالات، تصورات اور عمل کرنے کی تحریکات کا آماجگاہ بنا رہتا ہے بالکل اسی طرح خواب میں انسانی دماغ ایک لمحہ چین سے نہیں بیٹھتا۔ خواب کے اندر کئے ہوئے اعمال اگر حافظہ کی گہرائی میں نقش ہو جاتے ہیں تو وہ اس طرح یاد رہتے ہیں جس طرح بیداری میں کیا ہوا عمل یاد رہتا ہے۔ اگر بیداری کا عمل حافظہ کی گہرائی میں نقش نہ ہو تو وہ اسی طرح بھول کے خانے میں جا پڑتا ہے جس طرح خواب میں کئے ہوئے اعمال فراموش ہو جاتے ہیں۔

یہ کوئی تمثیل نہیں ہے عام تجربات اور مشاہدات ہیں جس سے ہر شخص کی زندگی پیاز کے چھلکوں کی طرح لپٹی ہوئی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام ابھی زندان میں ہی تھے بادشاہ نے خواب میں دیکھا سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی۔ سات دبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں اور سات سرسبز و شادات بالیں ہیں اور سات خشک۔ اور سات خشک نے سات سرسبز و شاداب بالوں کو کھالیا۔ بادشاہ اس عجیب و غریب خواب سے پریشان خاطر اور حیران تھا۔ درباریوں سے خواب کی تعبیر چاہی، درباری بھی اس خواب کی تعبیر بیان نہیں کر سکے اور اپنی درماندگی اور بیچارگی کو چھپانے کے لئے کہا، بادشاہ! یہ خواب نہیں ہے بلکہ پریشان خیالی ہے۔

ہم سچے خواب کی تعبیر تو دے سکتے ہیں مگر خیالات کا حل ہمارے پاس نہیں ہے۔

بادشاہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا اسی اثناء میں ساقی کو اپنا خواب اور حضرت یوسف کی تعبیر کا واقعہ یاد آگیا۔ ساقی نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا اگر آپ فرمائیں تو میں اس کی تعبیر لا سکتا ہوں۔ بادشاہ کی اجازت سے وہ اسی وقت قید خانہ پہنچا اور حضرت یوسف کو بادشاہ کا خواب سنا کر عرض کیا آپ اس خواب کا تجزیہ کیجئے۔ آپ سچائی اور تقدس کے پیکر ہیں، آپ ہی اس کو حل کر سکتے ہیں۔ قرآن پاک فرماتا ہے

کہا یوسف نے، تم لگاتار سات برس کھیتی کروگے۔ اپنے

استعمال کے علاوہ سب کی سب بالوں کو محفوظ کر دو۔ اس

کے بعد سات برس سختی کے آئیں گے جن میں کوئی فصل

نہ ہوگی۔ اس وقت یہ محفوظ غلہ تمہارے کام آئے گا۔

اس خواب سے جہاں خواب یا خواب میں دیکھے ہوئے حالات کی تائید ہوتی ہے وہاں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خواب مستقبل کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ جس کو ہم غیب کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

میرے عزیز! انسان خواب اور بیداری کے حواس کا مجموعہ اس لئے ہے کہ اس کے ساتھ غیب کے حواس چپکے اور لپٹے ہوئے ہیں۔ اگر انسان کے اندر خواب کے حواس یا مستقبل کے حالات سے متعلق تحریکات نہ ہوتیں تو انسان کبھی بھی مستقبل میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ جنت جہاں ماضی ہے وہاں مستقبل بھی ہے جو انسان کا اپنا اصلی مقام اور وطن مالوف ہے۔ اگر بیداری کے حواس خواب کے حواس سے زیادہ ہوتے تو انسان خواب کی دنیا (جنت، دوزخ) میں اپنے ارادہ کے تحت اپنے لئے کوئی مقام منتخب نہیں کر سکتا تھا۔

جنات کو انسانوں سے زیادہ ہمدرد اور غم خوار کہہ کر انسانوں کی ہر گز توہین نہیں ہوئی کیونکہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ وہی انسان جنات سے معزز و محترم ہیں جو اشرف المخلوقات کے دائرے میں قدم رکھ چکے ہیں۔ عام آدمی اشرف المخلوقات کہلانے کا ہر گز مستحق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں۔

زمین پر چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں اُڑنے والے کسی

پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔ (سورۃ انعام)

حقائق بہت تلخ ہوتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ جنات میں انسانوں سے زیادہ عارف ہوتے ہیں۔ اشرف المخلوقات اس انسان کو کہا جاتا ہے جو زماں اور مکاں کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر خالق حقیقی کا عرفان رکھتا ہو اور عرفان بھی کائنات میں عام موجودات کا سا نہیں بلکہ ایسا عرفان رکھتا ہو جس سے خائف ہو کر سماوات، ارض اور جبال نے انکار کر دیا ہے کہ ہم اس کے متحمل نہیں ہیں۔ ہم نے اپنی امانت پیش کی مگر سب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم اس کے متحمل نہیں ہیں۔ اگر ہم نے اس امانت کو اپنے نحیف کندھوں پر اُٹھالیا تو بے شک ہم نابود ہو جائیں گے اور انسان نے قبول کر لیا۔

میں نہ قوم کے جذبات سے کھیلنا چاہتا ہوں اور نہ ہی گمراہ کرنا میرا شیوہ ہے البتہ ہمارے سامنے پروگرام ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ روزنامہ حریت کے ذریعہ پاکستانیوں کو اس زندگی سے روشناس کردوں جس زندگی میں حزن ہے نہ ملال ہے۔ خوف ہے اور نہ غم ہے اور جس زندگی میں خوشیاں اور راحتیں انسان کی ہاتھ باندھی غلام ہیں۔ یہ وہ زندگی ہے جس میں انسان زماں اور مکاں کی پابندیوں سے آزاد ہو کر لامحدود وسعتوں کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ جہاں کھوکھلے نظریات، گھٹیا اخلاق اور بیہودہ عادات کو قطعاً دخل نہیں ہے۔

آپ لکھتے ہیں کہ مضمون پڑھ کر قاری تجسس کے عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ آپ تجسس کو عذاب بتا رہے ہیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ اگر زندگی میں سے تجسس اور تلاش کو نکالا جائے تو زندگی ناپید ہو کر رہ جائے گی۔ آدم کی پیدائش سے آج تک نوع انسان کی مجموعی زندگی جن مراحل سے گزری ہے ان میں ہر مرحلہ تجسس اور تلاش کے تانے بانے کے ساتھ بنا ہوا ہے۔ اس صدی کے انسانوں کو جس قدر وسائل آج مہیا ہیں اور جتنی قسمیں علوم و فنون کی آج ہمارے سامنے ہیں کیا وہ سب تلاش کے بغیر ممکن تھیں۔ آرام و آسائش سے متعلق ایجادات مثلاً ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلی ویژن سب کے سب تجسس ہی کی وجہ سے موجود ہیں۔

دعا گو

عظیمی

۱۳، جنوری ۱۹۶۹ء

محترم خواجہ صاحب

السلام علیکم

میں جاننا چاہتی ہوں کہ خواب ہر کس و ناکس کو بیان کرنا چاہئے یا نہیں

دوسرا سوال یہ ہے کہ آدمی خواب کیوں دیکھتا ہے اور خواب میں دیکھے ہوئے واقعات اور کئے ہوئے اعمال کیا واقعی کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔(انجم باسط، کراچی)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

بی بی! آدمی خواب کیوں دیکھتا ہے، اس کے جواب میں طویل تبصرہ درکار ہے البتہ اختصار کے ساتھ دو ایک بنیادی باتیں تحریر کی جاتی ہیں۔ نوع انسانی جب سے حواس رکھتی ہے وہ کچھ نہ کچھ سوچنے سمجھنے اور نتائج نکالنے کی عادی ہے۔ آج تک شعور کی کوئی شاخ خواہ وہ فلسفہ ہو، طبیعیات ہو یا نفسیات، کائنات کی بنیاد موج امکانی (لازمانیت) کے علاوہ کسی اور چیز کو قرار نہیں دے سکی۔

کائنات کی بنیاد میں تصور شے کی علاوہ خود شے کی محسوسیت اور شے کے ٹھوس پن کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ شبیہیں اور تصورات ہیں جو ہمارے دماغ کی سطح پر بنتے ہیں۔ ہم ان شبیہوں اور تصورات کے علاوہ کسی اور حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ خارجی دنیا میں وہ کون سے محرکات ہیں جو یہ شبیہیں نشر کرتے ہیں اور ان محرکات کی ماہیت کا بھی ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔

یہ بات نوع انسانی کو کبھی معلوم نہیں ہو سکی کہ زمانی مکانی محل وقوع اور اجزائے ترکیبی کیا ہیں.....

چنانچہ یہ کہنا کہ انسان کے ذہن کو صرف خارجی دنیا ہی کنٹرول کرتی ہے اور خارجی دنیا ہی دماغ کی سطح پر شبیہیں بناتی ہے۔ نیز حواس کا دروبست خارجی دنیا کے ہاتھ میں ہے محض مغالطہ ہے کہ کائنات کی بنیاد جب کہ موج امکانی ہے تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ موج امکانی خارجی ہو سکتی ہے داخلی نہیں ہو سکتی.....

یہ بنیادی غلطی ہے کہ موج امکانی کو کسی دائرہ میں خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی محدود کر دیا جائے۔ بہر صورت ہمارے حواس کی ڈوری جہاں سے اپنی جنبش شروع کرتی ہے وہ لازمانیت ہے اور لازمانیت کا خارج اور داخل نہیں ہوتا لہٰذا ہمارے لئے حواس کا محرک جس

طرح ماضی ہو سکتا ہے جس کو ہم خارجی اور مظاہری دنیا کہتے ہیں۔ معلوم اور نامعلوم کے درمیان خود ہمارے حواس نے پردہ کھینچ دیا ہے۔لازمانیت کا اس پردہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے حواس خواب میں بھی اسی طرح تحریک پاتے ہیں جیسے بیداری میں۔

آپ کا یہ سوال کہ خواب میں دیکھے ہوئے واقعات اور کئے ہوئے اعمال کیا واقعی اہمیت رکھتے ہیں۔اس کا جواب سورۂ یوسف میں موجود ہے۔ سورۂ یوسف میں چار خوابوں کا ذکر آیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا اے میرے باپ میں

نے خواب دیکھا ہے کہ سورج، چاند اور گیارہ ستارے

مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

اسی طرح جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں قید تھے تو قیدیوں میں سے دو قیدیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے خواب سنائے۔

ایک نے بتایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں انگور نچوڑ رہا ہوں.....

دوسرے نے کہا میں نے دیکھا ہے کہ میں سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اسے کھا رہے ہیں۔

قرآن کریم میں بیان کردہ چوتھا خواب بادشاہ مصر کا ہے۔ بادشاہ نے خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی گائیں۔ سات دبلی گائیں سات موٹی گائیں کو نگل رہی ہیں۔ سات بالیں ہری ہیں، دوسری سات سوکھی بالیں۔ سات خشک بالیں سات ہری بالوں کو کھا رہی ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن پاک میں بیان شدہ ان خوابوں میں ایک خواب پیغمبر کا ہے اور تین خواب عام انسانوں کے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ حالات و واقعات اسی طرح پیش آئے جس طرح خوابوں میں نشان دہی کی گئی تھی۔

اس سوال (کہ خواب کسی شخص سے بیان کرنا چاہئے یا نہیں) کے جواب میں عرض ہے کہ خواب کبھی کسی ایسے شخص سے بیان نہیں کرنا چاہئے جو کم سے کم بھی خواب کی تعبیر اور خواب کی فطرت سے واقف نہ ہو ورنہ اس کا جواب یا اس کی دی ہوئی تعبیر یا اس کے الفاظ خواب دیکھنے والے کے ذہن کو غلط محرکات پر ڈال سکتے ہیں۔

دعا گو

عظیمی

۲۸،اپریل،۱۹۶۹ء

جناب عظیمی صاحب

السلام علیکم

سوال یہ ہے کہ آدمی بعض اوقات امید اور یقین کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ساتھ حسرت و یاس اور درندگی و بیدردی پر مشتمل خواب کیوں دیکھتا ہے۔

ممتاز علی (جیکب آباد)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

عام حالات میں نگاہ ذہن کی سطح پر جو شبیہیں بناتی ہے اور جن چیزوں کی یہ شبیہیں ہوتی ہیں ان چیزوں کے اندر گہرائی کا ہونا بہت ضروری ہے چاہے وہ مثبت مقداریں ہوں یا منفی مقداریں۔

خواب میں جتنی شبیہیں ہمارے ذہن کی سطح پر بنتی ہیں وہاں گہرائی کی مقداریں منفی ہوتی ہیں۔ان مقداروں کے زیر اثر خواب دیکھنے والا توان شبیہوں یا شکلوں کو جو اس کی ذہنی سطح پر بنتی ہیں، دیکھ سکتا ہے لیکن دوسرے حضرات جو ارد گرد موجود ہوں، دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں کیونکہ وہ بیداری کی حالت میں ہیں اور بیداری میں مثبت مقداریں ہونا ضروری ہیں چاہے وہ کم سے کم ہوں۔ البتہ دونوں

صورتوں میں خواہ مقداریں منفی ہوں یا مثبت پس منظر میں کچھ نہ کچھ چیزیں ضرور ہوتی ہیں اور ان چیزوں کی نشریات ہمارے ذہن پر شبیہیں بناتی ہیں۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ مثبت مقداریں منفی میں اور منفی مقداریں مثبت میں ردوبدل کرتی رہتی ہیں۔ منفی مقداروں کی تعریف یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی ان حدود سے جو ہماری معین کردہ ہیں آزاد ہوتی ہیں۔

کائنات میں جو اصل اصول کارفرما ہے ان کا قرآن پاک

میں معاد کے نام سے تذکرہ کیا گیا ہے۔

معاد قدرت کی سنت ہے۔

مثال: ایک آدمی جو ہم سے دور پرے کسی دیوار کے پیچھے کھڑا بلند آواز سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کی آواز ہمارے ذہن کی سطح پر باتیں کرنے والے کی شخصیت کی شبیہہ بنا دیتی ہے۔ اگر ہم اس شخصیت کا نام جانتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص باتیں کر رہا ہے۔

اور زیادہ واضح طریقے پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی کی آواز ریکارڈ کر لی جائے تو ہم اس ریکارڈ کے ذریعہ ایک جگہ سے ہزاروں میل دور جا کر مہینوں اور سالوں گزرنے کے بعد بھی اس آواز کو سن سکتے ہیں۔ یہ آواز ہمارے ذہن کی سطح پر اس شخصیت کی شبیہہ بنا دیتی ہے۔ اگر شخصیت کا نام معلوم ہے تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص کی آواز ہے۔

کہنا یہ ہے کہ کسی شخصیت یا کسی چیز کو پہچاننے کا ذریعہ دراصل اس شخص یا شے کی شبیہہ ہوتی ہے خواہ منفی مقداروں میں ہو یا مثبت مقداروں میں۔ اب یہ ثابت ہو گیا کہ منفی مقداریں بھی وہی طاقت رکھتی ہیں جو مثبت مقداریں رکھتی ہیں اور ساتھ ہی منفی مقداریں ..... مثبت مقداروں کی طرح زمان و مکان کی پابند نہیں ہیں۔

لوح محفوظ کا قانون یہ ہے کہ ہر عمل کرنے والی شخصیت

موجود ہے، رہتی ہے اور ابد تک موجود رہے گی۔ اس کو ابدیت

حاصل ہے اور کوئی شخصیت قدرت کے اس اصل

اصول سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتی۔

یہ امر واضح ہے کہ منفی مقداریں زماں و مکاں کی گرفت سے بالکل آزاد ہوتی ہیں تاہم منفی اور مثبت میں یہ حقیقت مشترک ہے کہ دونوں کی بنائی ہوئی شبیہوں میں شخصیت موجود رہتی ہے۔

دعا گو

عظیمی

۹،جون،۱۹۶۹ء

ایم اے رفیق (مشرقی پاکستان)

بڑی بڑی دور بینیں بھی استعمال کی گئیں، یہ دور کی چیزوں کو قریب تو لے آتی ہیں لیکن طول موج کو بدل نہیں سکتیں۔ غیب میں ہزاروں بستیاں اور ہزاروں چیزیں ہیں جن کو خلائی آبادیاں اور خلائی مخلوق کہہ سکتے ہیں، ان سے روشنی کے جس طول موج کا صدور ہوتا ہے وہ طول موج ہماری آنکھوں سے تو گزر ہی جاتا ہے لیکن دماغی سطح سے بھی گزر جاتا ہے کیونکہ دماغی سطح انہیں روک نہیں سکتی، اپنے اندر جذب نہیں کر سکتی اس لئے ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

یہی صورت اس وقت عمل میں آتی ہے جب چاند اور سورج کے درمیان زمین آجاتی ہے، زمین کا حائل ہونا روشنی کے کئی طول موج منتشر کر دیتا ہے جو چاند کی سطح پر منعکس نہیں ہوتے اور نہ چاند کی سطح سے ہماری آنکھوں میں منتقل ہوتے ہیں۔ ہم کئی لاکھ میل سے چاند کو اس لئے دیکھ لیتے ہیں کہ چاند میں کام کرنے والے روشنی کے طول موج سے ہمارا شعور باخبر ہے اور خلائی آبادیوں کو اس لئے نہیں دیکھ سکتے کہ خلاء میں کام کرنے والے طول موج ہمارے شعور کی گرفت سے باہر ہیں۔

یہ عجیب سربستہ راز ہے کہ کائنات میں ہر مخلوق کے ساتھ لاشعوری طور پر ہم رشتہ ہے۔ لاشعوری تحریکات میں سے چند کو ہمارا شعور قبول کر لیتا ہے اور باقی تحریکات کو رد کر دیتا ہے۔ چاند سورج، کہکشاں، ستارے اور کائنات میں لاکھوں، کھربوں موجودات کو شعور زیادہ تر محسوس کرتا ہے مگر جن موجودات سے شعور کے قیام کا براہ راست تعلق ہے انہیں مظاہراتی خدوخال میں مشاہدہ کرتا ہے چونکہ چاند، سورج کی روشنی شعور انسانی کے لئے ضروری ہے اس لئے وہ لاشعور سے اس طول موج کو قبول کر لیتا ہے۔

اگر اسی طرح وہ یعنی شعور انسانی لاشعور کی کائناتی تحریکات کو بھی قبول کر لے تو انسان چاند، سورج اور ستاروں کی طرح تمام خلائی آبادیوں کا بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔

دعا گو

عظیمی

۹، جون، ۱۹۶۹ء

جناب السلام علیکم

گزارش ہے میرے حال پر رحم کر کے مجھے مفید مشورہ سے آگاہ فرمائیں۔

۔ہر وقت سستی اور پریشانی میں گرفتار رہتا ہوں

۔ نماز پڑھتے وقت نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے

جب کسی کام کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تو سر چکرانے لگتا ہے، دنیا گھومنے لگتی ہے، جسم پر اس طرح لرزہ آجاتا ہے اور قوت عمل مفلوج ہو جاتی ہے۔

میری مدد کیجئے، میدان حشر میں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دیں گے۔

دین محمد (میر پور خاص)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انسان کے بارے میں چار باتیں ارشاد کی ہیں

۱۔انسان جلد باز ہے

۲۔انسان ناشکرا ہے

۳۔جاہل ہے اور

۴۔ظالم ہے

ان الفاظ کی روشنی میں اپنی ذات کو جانچئے..... اپنی طبیعت کو پرکھئے اور ہمیشہ خوش رہیئے..... کیونکہ اللہ کی منشاء یہ ہے کہ انسان ان باتوں کو سامنے رکھ کر ناشکری، جلد بازی، جہالت اور ظلم سے باز رہے۔ جس وقت ان چیزوں سے الگ ہو گئے تو اب صرف خوشی باقی رہ گئی۔ جب زندگی کا طرز عمل اس بنیاد پر مستحکم ہو جاتا ہے تو پھر کوئی بات ناخوش نہیں کر سکتی اور یہی حل ہے تمام مسائل کا۔

جلد بازی اور ناشکری کا نتیجہ ذہنی کشاکش اور دماغی کشمکش ہوتا ہے۔ وجہ معلوم نہ ہونا جہالت ہے اور جہالت میں گرفتار رہنا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔

دعا گو

عظیمی

۸، دسمبر، ۱۹۶۹ء

جناب حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاۃ

عرض ہے کہ آپ امتحان میں کامیاب ہونے یا اول پوزیشن حاصل کرنے کے لئے مختلف وظائف بتاتے ہیں مثلاً کسی کو

"یا حیی یا قیوم"

کسی کو

"رب یسرولا تعسر رب تمم بالخیر"

اور کسی کو صرف

"رب یسرولا تعسر"

پوچھنا یہ ہے کہ امتحان میں کامیابی کے لئے ایک ہی وظیفہ کیوں تلقین نہیں کیا جاتا۔ اگر ایسا ہو تو ہر شخص آسانی کے ساتھ مفید مطلب وظیفہ پڑھ سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں بھی مضمون کی کمزوری دور کرنے اور امتحان میں پاس ہونے کے لئے وظیفہ پڑھوں لیکن نہیں پڑھ سکتا کیوں کہ وظیفہ کا تعین نہیں کیا گیا ہے کہ فلاں وظیفہ امتحان میں پاس ہونے کے لئے ہے۔

مسعود شاہ (کوہاٹ)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

روحانیت میں یہ سکھایا جاتا اور مشاہدہ کرایا جاتا ہے کہ کائنات اللہ کے نور سے بنی ہے۔

اللہ نور السمٰوات والارض O

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

کائنات میں موجود ہر شے کے اندر نور کی لہریں کام کر رہی ہیں لیکن ہر فرد میں ان لہروں کی مقدار الگ الگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرد کی شکل و صورت اور خیالات و تصورات ایک دوسرے سے ممیز ہوتے ہیں۔ کسی روحانی انسان کو یہ سیکھنا پڑتا ہے کہ مسائل کے اندر نور کی لہریں کس مقدار میں کام کر رہی ہیں اور ان لہروں سے کس قسم کے خیالات و تصورات مظہر بن رہے ہیں۔

پھر یہ سمجھنا ہوتا ہے کہ کس لفظ یا وظیفہ میں کون کون سی نور کی لہریں بر سر عمل ہیں۔ ان دونوں لہروں کے تطابق سے وظیفہ تجویز کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہر شخص کے لئے وظیفہ الگ تجویز ہو گا۔

آپ کی ذات میں اللہ کے نور کی جو لہریں کام کر رہی ہیں ان کے پیش نظر آپ کے لئے بعد نماز عشاء تین سو مرتبہ ''الحی القیوم'' کا ورد مناسب اور مفید ہے۔

دعا گو

عظیمی

۶، مارچ ۱۹۷۰ء

محترم حضرت جی

آداب

پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر کوئی ''منت'' مانی ہو تو اسے کیسے اتارا جائے۔ میں نے پچھلے سال منت مانی تھی کہ بی اے کے امتحان میں پاس ہو جاؤں گی تو حضرت امام حسین کے نام کے پیالے بھروں گی۔

یہ بھی بتائیں کہ منت مانی کیوں جاتی ہے۔

میں نے منت لاہور میں مانی تھی اور اب میں مشرقی پاکستان میں ہوں، کیا مجھے منت پوری کرنے کے لئے لاہور جانا پڑے گا۔

کومیلا (مشرقی پاکستان)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

منت اظہار عقیدت ہے۔ دنیا کی جتنی قومیں ہیں وہ اپنی قوم کے محسنوں سے عقیدت رکھتی ہیں اور کوئی بھی اس قسم کا طرز عمل اختیار کرتی ہیں جو ان کی یاد تازہ کر سکے اور ان کے مستحسن کردار کے نقوش کا احیاء کر سکے۔ اظہار عقیدت کا طریقہ استطاعت پر منحصر ہے تاکہ اس قسم کے اظہار میں مشکلات پیدا نہ ہوں۔ آسان صورتیں یہی ہیں قرآن خوانی کی جائے اور ضرورت مندوں کی خدمت کی جائے، بے نواں لوگوں کو کھانا کھلایا جائے۔

اظہار عقیدت میں ایک اصول مرکزی نقطہ کی حیثیت

رکھتا ہے، وہ..... انسانی ہمدردی..... انسانی خدمت اور

ایثار ہے۔

ایثار اتنا ہی کیا جا سکتا ہے جتنی توفیق ہو۔ کھانا کس طرح کا ہو..... جگہ کوئی ہو اس کا تعین کرنا زائد ہے..... اللہ دلوں کو اور نیتوں کو جانتا ہے۔

دعا گو

عظیمی

۲۲،جون ۱۹۷۰ء

محترم بزرگ

السلام علیکم

اس تاریخی واقعہ کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے کہ جب ہمایوں بیمار ہوا تو بابر نے ہمایوں کے گرد طواف کر کے یہ دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ میری زندگی میرے بیٹے کو دیدیں نتیجہ میں شہنشاہ بابر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور ہمایوں صحت یاب ہو گیا۔

تسلیم بیگم جی اے (کراچی)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

قانون قدرت کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ ہر شہود کے پس پردہ غیب ہوتا ہے۔ غیب سے ہی شہود یا مظہر نمود ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے سامنے ایک درخت ہے..... اس درخت کے تمام ظاہر پہلو ہماری عقل کے دائرہ میں شامل ہیں۔ ہم ان کا تجزیہ کر سکتے ہیں..... ان کو دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں لیکن اس کا داخلی پس منظر بھی ہے۔ جس کے بارے میں ہماری فکر ہمارے تجربات کے نتائج صفر کے برابر ہیں۔

اگر موجودہ سائنس کی رو سے ہم کسی مادی شے کی تقسیم الیکٹران تک کر سکتے ہیں یا روشنی کی تقسیم پروٹان تک۔ پھر بھی یہ تشنگی باقی رہتی ہے جس کے بارے میں ہم بالکل لاعلم ہیں کہ

پروٹان کیا ہے.....

الیکٹران کیا ہے.....

اس کی تعمیر کیسے ہوئی اور اس کی اصل کیا ہے.....

شروعات میں کیا تھا اور شروعات سے پہلے اس کی نوعیت کیا تھی.....

یہ سارے پہلو مخفی اور غیب ہیں۔ انسان جہاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اس کے بعد پھر غیب آ جاتا ہے۔ یہی وہ پیچیدہ مسئلہ ہے جس کو سائنس نہیں سلجھا سکی نہ سمجھ سکی ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ نہ جاننے کے باوجود بھی انسان کا ذہن تجسس میں لگا رہتا ہے۔ اگر کسی ایک لمحہ کے لئے بھی انسانی ذہن مکان (Space) کی گرفت سے آزاد ہو کر زمان (Time) کی حد میں داخل ہو جاتا ہے وہاں وہ حقیقت کو چھو دیتا ہے اور حقیقت کو چھو دینے کے معنی ہیں عمل۔ جیسے ہی اس کا ذہن زمان سے مکان کی طرف واپس آتا ہے تو وہ شے جس کو اس کے ذہن نے چھوڑ دیا تھا عملی دنیا میں داخل ہو جاتی ہے یا تو فوری طور پر یا کچھ وقفہ کے بعد یا زیادہ وقفہ کے بعد۔

قانون کی دفعہ یہ ہوئی کہ ہر شہود کا غیب ہے اور غیب زمان (Time) کی گہرائی میں ہوتا ہے۔ ذہن مکان (Space) سے نکل کر اگر اسے چھوڑ دے تو اس وقت جو کچھ ذہن میں ہو گا مکان میں آ جائے گا اور مظہر بن جائے گا۔ چنانچہ بابر کے ذہن میں جیسے ہی یہ بات آئی کہ میری جگہ ہمایوں کو زندہ رہنا چاہئے، اس جذبہ کی گہرائی اتنی تھی کہ یہ مکان (Space) کی حدود سے نکل کر غیب یا زمان (Time) کے اندر پہنچ گیا۔ جیسے ہی واپسی ہوئی مظہر بن گیا۔ جذبہ کی گہرائی بہت زیادہ تھی اس لئے مظہر فوراً بن گیا۔

دعا گو

عظیمی

۲، فروری ۱۹۷۷ء

جناب عظیمی صاحب

السلام علیکم

آپ نے ایک کالم میں تحریر کیا ہے کہ صلوٰۃ ہمارے اوپر غیب منکشف کر دیتی ہے اور ہم فرشتوں کی دنیا سے روشناس ہو جاتے ہیں اور الصلوٰۃ معراج المومنین کے مصداق صلوٰۃ میں بندہ کا اللہ سے تعلق قائم ہو جاتا ہے یعنی بندہ غیب کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ برائے کرم اس کی مزید وضاحت فرمادیں۔

یوسف (اسپین)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

صلوٰۃ اس مخصوص عبادت کا نام ہے، جس میں بندہ کا اپنے خالق کے ساتھ براہ راست ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ صلوٰۃ بندہ کو ایسی روحانی کیفیت سے آشنا کرتی ہے جس سے بندہ اپنے ماحول میں موجود ہر چیز اور خود اپنی نفی کر کے اللہ کی حضوری حاصل کرتا ہے۔ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق ہر پیغمبر نے اپنی امت کو صلوٰۃ قائم کرنے کی تعلیم دی ہے اور اس کی تاکید کی ہے۔ اس پروگرام میں بنیادی مقصد یہ رہا کہ بندے کا اللہ سے جو رشتہ قائم ہے بندہ اس سے واقف ہو جائے۔ انبیائے کرام نے ہمیں بتایا کہ اللہ کو پہچان لیں اور ان کا ذہنی ارتباط اللہ کے ساتھ قائم ہو جائے۔

انسان کے اندر دو دماغ کام کرتے ہیں۔ ایک دماغ جنتی دماغ ہے یعنی آدم کا وہ دماغ جو نافرمانی کا مرتکب نہیں ہوا تھا اور دوسرا دماغ اسفل السافلین کا دماغ ہے جو حکم عدولی کی بنا پر وجود میں آیا۔

اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات کے تحت جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کے اندر صرف ایک دماغ تھا۔ جس کا شیوہ فرمانبردار ہو کر زندگی گزارنا تھا اور جب حضرت آدم علیہ السلام سہواً اپنا اختیار استعمال کر کے نافرمانی کے مرتکب ہوئے تو اس دماغ کے ساتھ ایک دوسرا ذیلی دماغ وجود میں آگیا جو نافرمانی اور حکم عدولی کا دماغ قرار پایا۔

جب تک آدم اور حوا جنت کے دماغ کی حدود میں زندگی گزارتے رہے وہ ٹائم اسپیس کی قید سے آزاد رہے لیکن جب وہ شجر ممنوعہ کے قریب چلے گئے تو ان کے اوپر ٹائم اسپیس مسلط ہو گیا یعنی آزاد دماغ قید و بند اور صعوبت میں گرفتار ہو گیا۔ زمین میں قید ہو کر زندگی گزارنے کے لئے حضرت آدم علیہ السلام نے نئے اصول و قواعد مرتب کر لئے مثلاً بھوک و پیاس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کھیتی باڑی کا اہتمام ور محنت و مشقت کے ساتھ انتظار کی زحمت برداشت کرنا جبکہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کے لئے انتظار نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کے حضور اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور عفو و درگزر کی درخواست پیش کی۔ اللہ نے ارشاد فرمایا۔

ہم اپنے بندے بھیجتے رہیں گے جو تمہیں صراط مستقیم کی ہدایت کریں گے اور جو لوگ ان برگزیدہ پیغمبروں کی ہدایات پر عمل پیرا ہوں گے ہم ان کا اصل وطن جنت دوبارہ عطا فرمادیں گے۔

حضرت آدم علیہ السلام جنت میں اللہ کے منع کرنے کے باوجود جب ممنوع درخت پر چلے گئے (جانے کی کوئی بھی صورت ہو) تو اللہ سے وہ ربط قائم نہیں رہا جو پہلے تھا۔ چونکہ یہ ربط (عارضی طور پر) ٹوٹ گیا تھا اس لئے جنت کے دماغ نے انہیں رد کر دیا۔

عربی کی ایک مثل ہے ''ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے'' لہٰذا ہمیں اس دماغ کو حاصل کرنے کے لئے جو ٹائم اسپیس سے آزاد ہے وہی طریقہ اختیار کرنا ہو گا جس طریقے سے ہم نے اس دماغ کو کھویا ہے یعنی ہم اپنے اختیار کے تحت اس دماغ کو رد کریں جس کی حدود میں رہ کر ہم آزاد دماغ سے دور ہو گئے ہیں۔

اس ربط کو تلاش کرنا، قرآن پاک کی زبان میں قیام صلوٰۃ ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے ''قائم کرو صلوٰۃ'' یعنی اللہ کے ساتھ اپنا ربط اور تعلق قائم کرو..... ایسا ربط جو ہر حال میں قائم رہے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے اوپر نافرمانی کے بعد وجود میں آنے والا دماغ غالب ہے اور فرمانبرداری کا دماغ مغلوب ہے۔ ہم غائب و مغلوب دماغ میں ردوبدل ہوتے رہتے ہیں۔ قرآن پاک نے اس ردوبدل کا تذکرہ رات اور دن کے نام سے کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ہم داخل کرتے ہیں رات کو دن میں اور داخل کرتے ہیں دن کو رات میں۔ (القرآن)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا

نکالتے ہیں دن کو رات میں سے اور نکالتے ہیں رات کو دن میں سے۔(القرآن)

یعنی حواس ایک ہی ہیں۔ان میں صرف درجہ بندی ہوتی رہتی ہے دن کے حواس میں زمان و مکان کی پابندی ہے لیکن رات کے حواس میں بندہ مکانیت اور زمانیت سے آزاد ہے۔رات کے یہی حواس ہیں جو غیب میں سفر کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور انہی حواس سے انسان برزرخ،اعراف،ملائکہ اور ملاءاعلیٰ کا عرفان حاصل کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں اللہ فرماتا ہے

اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا اور پورا کیا

ان کو دس سے تب پوری ہوئی مدت چالیس رات۔

اللہ فرمارہا ہے کہ چالیس رات میں تورات (غیبی انکشافات) ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی۔فرمان خداوندی بہت زیادہ غور طلب ہے اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے چالیس دن میں وعدہ پورا کیا،صرف رات کا تذکرہ فرمایا ہے۔کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اوپر رات کے حواس غالب رہے۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معراج کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے،پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف تاکہ اسے اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کروائے۔رات کے حواس میں (سونے کی حالت میں) ہم نہ کھاتے ہیں،نہ بات کرتے ہیں اور نہ ہی ارادتاً ذہن کو دنیوی معاملات میں استعمال کرتے ہیں۔قیام صلوٰۃ کا پروگرام ہمیں یہی عمل اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔صلوٰۃ کی حالت میں ہمارے اوپر تقریباً وہ تمام حواس وارد ہو جاتے ہیں جن کا نام رات ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ (نماز) میں وہ تمام حرکات جمع فرمادی ہیں جن حرکات و سکنات میں انسان زندہ رہتا ہے۔

دعا گو

عظیمی

۱۷،جنوری،۱۹۰۸ء

-1D-1/7 ،ناظم آباد، کراچی

محترم خواجہ صاحب

السلام علیکم

تصوف میں تصور شیخ کی بڑی اہمیت ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ روحانیت سیکھنے کے لئے تصور شیخ کیوں ضروری ہے..... کیا روحانیت تصور شیخ کے مراقبہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

شکریہ

چودھری جلال الدین (لاہور)

محترم چوہدری جلال الدین صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاۃ

روحانی علوم ہو یا مادی، دونوں منتقل ہوتے ہیں۔ مثلاً جب ہم بچہ کو کسی استاد کی شاگردی میں دیتے ہیں تو استاد بچہ کو بتاتا ہے۔ یہ الف ہے، یہ ب ہے، یہ ج ہے۔ براہ راست اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ استاد کے ذہن میں الف کا جو تصور یا خاکہ تھا وہ بچہ کے ذہن میں منتقل ہو گیا۔ اگر کسی بچہ کو یہ نہ بتایا جائے کہ یہ الف ہے تو وہ کبھی بھی الف سے آشنا نہ ہو گا اور نتیجہ میں علم حاصل کرنے سے محروم رہ جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق قانون یہ ہے کہ ساری کائنات ''روشنی'' ہے۔ ایسی روشنی جو ہر لمحہ اور ہر آن متحرک رہتی ہے۔ وہم، خیال، تصور، احساس سب روشنی کے تانے بانے پر رواں دواں ہیں۔ ہم جب بات کرتے ہیں تو منہ سے نکلے ہوئے الفاظ روشنی کے دوش پر سفر کر کے ہمارے کانوں کے پردوں سے ٹکراتے ہیں اور دماغ مفہوم اخذ کر کے ان کی معنویت سے ہمیں آگاہ کرتا ہے۔

جب کوئی آدمی بہرہ ہو جاتا ہے تو اس کے کانوں میں آلہء سماعت لگا دیا جاتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس آلہ میں بیٹری کے سیل لگے ہوتے ہیں اور ساتھ چھوٹا سا لاؤڈا سپیکر ہوتا ہے۔ مخالف جب بہرے شخص سے بات کرتا ہے تو بجلی کے ذریعہ آواز کا ویو لینتھ بڑھ جاتا ہے اور اتنا زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ بہرا شخص آواز کے مفہوم اور معنی کو اسی طرح سمجھتا ہے جس طرح عام آدمی سنتا اور سمجھتا ہے۔ مثال سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آواز روشنی کی لہروں کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ جب آواز..... روٹین سے کم ہو جاتی ہے یا کانوں کے اندر لاؤڈا سپیکر کام نہ کرے تو آدمی آوازیں نہیں سن سکتا۔ بعض مریض ایسے ہوتے ہیں کہ بہت معمولی آواز کاوں کے پردوں سے ٹکراتی ہے تو ان کو دماغ کے اندر دھماکہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ معمولی آواز سے بھی پریشان اور خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی بجز اس کے کچھ نہیں کہ لاؤڈا سپیکر کسی وجہ سے خراب ہو گیا ہے۔

ہر شخص کے ساتھ کبھی نہ کبھی یہ بات پیش آتی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو اشاروں سے کوئی بات سمجھاتا ہے۔ اس کے دماغ میں جو خیالات ہوتے ہیں ان خیالات کو اسی طرح قبول کر لیتا ہے جس طرح خیالات، الفاظ کا جامہ پہن کر مخاطب کے دماغ میں منتقل ہوتے ہیں۔ آپ ڈرائنگ روم میں چند دوستوں کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں..... ڈرائنگ روم میں کوئی آجاتا ہے۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ ڈرائنگ روم میں نہ آئے۔ الفاظ کا سہارا لئے بغیر اسے آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں..... دماغ میں یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ یہاں سے چلا جائے..... اس خیال کو وہ پڑھ لیتا ہے..... اور معنی اور مفہوم سمجھ کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بہت سے رازدارانہ خیالات ہمارے اندر آپس میں ردوبدل ہوتے رہتے ہیں اور ہم ان سے اسی طرح خوش ہوتے یا غمگیں ہو جاتے ہیں جس طرح الفاظ کا تاثر ہمارے اوپر قائم ہوتا ہے۔

کسی خوبصورت منظر کو دیکھ کر اپنے اندر سکون کی لہروں کا ایک ہجوم محسوس کرتے ہیں۔ دوسری طرف کسی منظر کو دیکھ کر ہمارا دماغ بوجھل، پریشان اور افسردہ ہو جاتا ہے..... نتیجہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ منظر کے اندر جس قسم کی روشنیاں دور کر رہی ہیں وہ ہمارے اندر منتقل ہو کر ہمیں پر سکون یا پریشان کر دیتی ہیں۔

آج کل ماورائی علوم میں ٹیلی پیتھی کا علم بہت زیادہ قبولیت عام حاصل کر گیا ہے۔ ٹیلی پیتھی کا اصول بھی یہی ہے کہ الفاظ کے بغیر خیالات ایک دوسرے کو منتقل کر دیئے جائیں۔ ٹیلی پیتھی نے اتنی کامیابی حاصل کر لی ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں بیٹھے ہوئے شخص کو خیالات منتقل کر دیئے جاتے ہیں۔ مثالوں سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ زندگی اور زندگی کے سارے مقاصد لہروں کے اوپر سفر کرتے ہیں۔

تصوف میں تصور شیخ سے مراد ہے کہ شیخ (استاد) کی طرز فکر مرید کے اندر منتقل ہو جائے۔

جیسے جیسے آدمی مراقبہ میں ذہنی یکسوئی کے ساتھ شیخ کا تصور کرتا ہے، شیخ کے اندر روحانی صلاحیت بتدریج مرید کی روحای صلاحیتوں کو طاقت ور بنادیتی ہیں۔ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شیخ کی صلاحیتیں مرید کے اندر منتقل ہو جاتی ہیں۔اس مقام کو تصوف میں ''فنا فی الشیخ'' کہا جاتا ہے۔

اسی طرح جب کسی بندہ کے اندر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت، عشق کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو اس مقام کا نام تصوف میں ''فنا فی الرسول'' ہے۔تصور شیخ کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وقت مقرر کر کے اسباق پڑھنے اور سانس کی مشق کے بعد مرید آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے اور یہ تصور کرے کہ شیخ اس کے سامنے ہے۔تصور میں ذہنی یکسوئی ہونا ضروری ہے۔

ذہنی یکسوئی حاصل کرنے کے لئے مراقبہ کرنے سے پہلے صاحب مراقبہ کو ناک پر چند منٹ نظر جمانی چاہئے۔اس عمل سے مراقبہ میں بہت جلد یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔

دعا گو

عظیمی

۱۸، مئی،

۱۷، جنوری، ۱۹۰۸ء

D-1/7-1، ناظم آباد، کراچی

شمع علیم صاحبہ

اللہ کے جن بندوں کو نور نبوت کا علم عطا ہوا ہے وہ واقعہ شق القمر کی روحانی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ انسان ستر ہزار پرت کا مجموعہ ہے۔ جب اللہ کے قانون کے مطابق کوئی انسان عالم سماوات سے عالم عنصری پر آتا ہے تو اس کے اوپر ایک پرت ایسا غالب آجاتا ہے جس میں سرکشی، بغاوت، عدم تعمیل، کفران نعمت، ناشکری، جلد بازی، شک، بے یقینی اور وسوسوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ یہی وہ ارضی زندگی ہے جس کے بارے میں قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ پھر پھینک دیا، اسفل سافلین میں۔

انبیاء چونکہ نوع انسانی کا جوہر ہیں ان کے اوپر اللہ کی خصوصی نعمتیں، عنایتیں اور نوازشیں ہوتی ہیں۔ ان میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انبیاء کے دل کو اسفل خامیوں سے پاک کر کے دنیاوی لالچ اور حرص و طمع سے بے نیاز کر دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں انبیاء کے قلوب ایمان، ایقان، علم و دانش، عرفان و آگہی اور انوار الٰہیہ سے منور ہو جاتے ہیں۔ ہدایت، معرفت، عظمت، اخلاص، رحمت، علم و حکمت اور نبوت کے لئے ان کے دلوں کو کشادہ اور وسیع کر دیا جاتا ہے۔

نور نبوت ﷺ کے زیر اثر روحانی علم مشاہداتی علم ہے۔ اس علم کی روشنی میں انسان کی تخلیق کے بنیادی عناصر نور اور روشنی سے مرکب ہیں۔ دنیا چھ سمتوں پر قائم ہے۔ یہ چھ سمتیں روشنی اور نور کے ہالے میں بند ہیں۔ چھ سمتیں دراصل تین یونٹ ہیں اور ہر یونٹ کے دو رُخ ہیں۔

روشنی مرکب..... روشنی مفرد

روشنی مطلق..... نور مرکب

نور مفرد..... نور مطلق

اسفل زندگی روشنی مرکب ہے اور اس کا مخزن پیٹ میں ناف کے مقام اور سینہ میں قلب کی جگہ ہے۔

اللہ نے اپنے محبوب ﷺ کے اوپر چونکہ تمام نعمتیں پوری کی ہیں اور ان کے اوپر دین کی تکمیل فرمائی ہے اس لئے اسی عمر میں جب شعور اسفل زندگی کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے اور اسفل زندگی میں دلچسپی لینا شروع کرتا ہے، اللہ نے دو فرشتے بھیجے اور ننھے محبوب ﷺ کے اسفل خیالات کے پیٹرن کو خالی کر کے اعلیٰ علیین خیالات سے بھر دیا۔ قرآن فرماتا ہے۔

انوار الٰہی کے ذریعہ محمد ﷺ کا سینہ مبارک اطمینان اور سکون سے بھر دیا گیا اور اللہ پاک نے سچائیوں، نیکیوں اور پاکیزہ خیالات کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لئے حضور قلب عطا فرمایا۔ (سورہ انشراح)

تطہیر قلب و جان اور خاص نگرانی و نگہبانی کے ساتھ ننھے محبوب ﷺ کی پرورش اور تربیت ہوتی رہی۔ دنیا کے نشیب و فراز سے وقوف حاصل کر کے ننھا محبوب سچائی، پاکیزگی اور یقین کے پیکر کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

پاکیزگی اور تقدس کی یہ روشن قندیل محمد ﷺ اپنے دادا حضرت ابراہیمؑ کی طرز فکر کے مطابق اللہ کی تلاش میں غور و فکر کے لئے غار حرا میں تشریف لے گئے۔ حضرت جبرائیل اللہ کے اس تربیت یافتہ بندے کے پاس آئے اور کہا پڑھ اپنے رب کے حکم سے۔ رسول اللہ ﷺ کے حالات زندگی ہمیں اس بات پر تفکر کی دعوت دیتے ہیں کہ ایک نبی ﷺ اور نبیوں میں خاتم الانبیاء ﷺ اور باعث تخلیق کائنات ﷺ کی تربیت کا دور بچپن سے شروع ہوا ہے۔

پانچ برس کی عمر میں روح القدس فرشتے کے ذریعے قلب مبارک کی صفائی اس بات کی نشاندہی ہے کہ حضور ﷺ کا ہر اُمتی اس قانون کا پابند ہے کہ وہ اپنے بچوں کی نگہداشت میں اس قانون کا پابند رہ کر اپنی تطہیر اور پاکیزگی قلب کا اہتمام کرے تاکہ اسفل حواس شعوری زندگی پر غالب نہ آئیں اور بچے کے اندر پیغمبرانہ طرز فکر مستحکم طریقے پر منتقل ہو جائے۔

جب پیغمبرانہ طرز فکر پر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ سورج زمین سے نو کروڑ میل کے فاصلے پر ہے۔ جب کوئی شخص سورج کو دیکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہر آدمی کے اندر نو کروڑ میل دور دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔

خاتم النبیین ﷺ نے پانچ برس کی عمر میں حضرت جبرائیل کو دیکھا۔ پھر غار حرا میں مراقبہ فرمایا اور وہاں حضرت جبرائیل قرآن لے کر نازل ہوئے۔ قرآن پاک فرماتا ہے۔

ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔ لیلۃ القدر بہتر ہے ہزار مہینوں سے۔ اترتے ہیں اس میں ملائکہ اور روح اپنے رب کے حکم سے۔ یہ رات رہتی ہے طلوع فجر تک۔

روحانی قانون کے مطابق لیلۃ القدر میں حواس کی رفتار ساٹھ ہزار گنا ہو جاتی ہے اور جب حواس کی رفتار ساٹھ ہزار گنا ہو جاتی ہے تو نظروں کے سامنے فرشتے اور جبرائیلؑ آجاتے ہیں۔ نبی برحق ﷺ کی یہ فضیلت ہے کہ عام انسانی حواس کی رفتار سے حضور نبی مکرم ﷺ کی ذہنی صلاحیت ساٹھ ہزار گنا سے زیادہ ہے۔

آیئے دعا کریں کہ ہمارے اندر بھی نبیوں کی طرز فکر پیدا ہو اور ہم بھی اپنے آقا ﷺ کے نور نبوت سے سرفراز ہو کر اپنی ذہنی رفتار تیز کریں تاکہ امتی ہونے کی حیثیت سے ہمیں ہمارے نبی ﷺ کا ورثہ منتقل ہو جائے۔ آمین یارب العالمین۔

دعا گو

عظیمی

۱۰، اکتوبر، ۱۹۸۰ء

D-1/7-1، ناظم آباد، کراچی

عزیزی نجم الدین

سوچ کی دو طرزیں ہیں۔

ا۔ زندہ رہنے کے لئے ماحول سے متاثر ہو کر ہم خود کو وسائل میں قید کر لیتے ہیں۔ آسائش و آرام اور روٹی کپڑے کے علاوہ دوسری کوئی شے ہمارے لئے اہمیت نہیں رکھتی اور یہ عمل ہماری زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔

۲۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ مادی دنیا میں ہم نے کیا کھویا، کیا پایا ہے۔

دنیا میں عزت و جاہ کا خوشنما لباس زیب تن کرنے کے لئے ہم دولت جمع کرتے ہیں۔ اس دولت کی تشہیر کے لئے عالی شان محلات بناتے ہیں۔ گھروں کو اس طرح سجاتے ہیں کہ لوگ انہیں دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں۔ قرض لے کر قیمتی کاریں خریدتے ہیں۔ دولت سے عزت و توقیر کا حصول خود فریبی ہے۔ ایسی خود فریبی جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فراعین مصر کے مقبرے، شداد و نمرود کے محلات اور قارون کے زمین میں دفن خزانے ہمیں بتا رہے ہیں کہ دولت نے کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ تاریخ خود کو دہراتی رہتی ہے اور ہر زمانے میں دولت کی حقیقت کو ہمارے اوپر آشکار کرتی رہتی ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہوں کا ماضی ہمارے لئے آئینہ ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شان و شوکت اور شاہی دبدبہ کے حامل بادشاہوں کو مادر وطن میں قبر بھی نصیب نہیں ہوئی۔ سب واقف ہیں کہ سونے چاندی کے ذخیروں اور جواہرات نے کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔ مٹی نہ صرف یہ کہ خود کو پہچانتی ہے بلکہ ایک ایک ذرہ کو اپنی کوکھ سے جنم دیتی ہے۔

مٹی کو اگر ایک فرد مان لیا جائے تو ہر شے مٹی ہے۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ آدمی چاہے تو پچاس کمروں کا مکان بنا لے لیکن سوئے گا وہ ایک چارپائی کی جگہ..... چاہے تو ہوس زر میں سونے چاندی (مٹی کے ذرات) سے خزانے بھر لے لیکن پیٹ دو روٹی سے بھر جاتا ہے۔ ماحول کو مصنوعی روشنیوں اور خوشبوؤں سے کتنا ہی معطر کر لیا جائے آدمی کے اندر کی سڑاند کا نعم البدل نہیں ہوتا۔ زمین کی فطرت ہے کہ وہ اپنی اولاد کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتی ہے اور صاف ستھرا رکھتی ہے اور جب اولاد تعفن سے نہیں نکلنا چاہتی تو وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتی ہے اور اس کے ادبار کی وجہ سے آدمی گھناؤنا اور ناسور زدہ ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ کسی آدمی کے لئے اس سے بڑا اور دردناک عذاب کوئی نہیں۔

اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے لئے خرچ نہیں کرتے، ان کے لئے عذاب الیم کی بشارت ہے۔ قرآن

صدیوں سے زمین پر ہونے والی تبدیلیاں اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ زندگی کے ادوار، زمانہ کے نشیب و فراز اور سائنسی ایجادات زمین کے سینہ میں محفوظ ہیں۔ زمین یہ بھی جانتی ہے کہ کتنی تہذیبوں نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور پھر یہ تہذیبیں زمین دوز ہو کر صفحہ ہستی سے غائب ہو گئیں۔ خلا کے پاس آسمان کی وسعتوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو مایوسیوں، ناکامیوں اور ذہنی افلاس کے علاوہ ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے کہ زمین کے باسیوں کا اپنی ذات سے فرار اور منفی طرز عمل دیکھ کر نیلے پربت پر جھلمل کرتے ستاروں کی شمع امید کی لو مدھم پڑ گئی ہے۔ وہ آدمی جو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ذہنی اعتبار سے حیوانات سے بدتر زندگی گزار رہا ہے۔ فی الوقت جو سکون بلی اور بکری کو حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی آدمی کو میسر نہیں ہے۔

تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والی ہستی، خود مختار خالق نے اس دھرتی کو ایک قطعہ زراعت بنا کر آدم کے حوالے کیا ہے کہ وہ اس کے سینہ پر سر رکھ کر میٹھی نیند سو سکے۔ اسی لئے اس کی تخلیق کا ظاہری جسم مٹی سے بنایا گیا اور اس کے استعمال کی ہر چیز مٹی سے بنائی گئی ہے۔ زمین کو قدرت نے اتنا سخت نہیں بنایا کہ آدم زاد اس پر چل نہ سکے، اتنا نرم نہیں بنایا کہ آدم زاد کے پیر زمین میں دھنس جائیں۔ اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ زمین پر تصرف کر سکے اور زمین کے جسم میں دوڑنے والے خون (Rays) سے جس طرح چاہے استفادہ کرے۔ لاکھوں کروڑوں سال پہلے کے آدم کی طرح آج بھی آدم زاد زمین کے سینہ پر کھیتی باڑی کرنے میں مصروف عمل ہے۔ اس کھیتی کا ہر جزو بھی آدم کی طرح مٹی ہے۔ جو کچھ بوتا ہے اس کا بیج بھی مٹی ہے۔ پودا بھی مٹی کی بدلی ایک شکل ہے۔ درخت بھی مٹی کے اجزاء سے مرکب ہے اور ہر پر شکوہ عمارت بھی مٹی ہے۔ بڑی بڑی ایجادات کا مصالحہ (Raw Material) بھی مٹی ہے۔ آدمی جس طرح سے سبز درخت اور ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اگاتا ہے اسی طرح بلند و بالا عمارتیں، دیو ہیکل جہاز اور دیگر اشیاء بھی مٹی سے بنی ہوئی ہیں۔

آدمی مٹی ہوتا ہے اور مٹی سے یہ نتائج حاصل کرتا ہے۔ بوائی اور کٹائی کا یہ عمل متواتر اور مسلسل جاری ہے کیونکہ آدمی زمین پر ایک فعال رکن ہے اور قدرت نے اسے ارادے کا اختیار دیا ہے۔ عمل اور رد عمل، حرکت اور نتائج کے اس قانون کو نبی مکرم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

موجودہ پرآشوب دور میں قول و فعل میں تضاد کا عالم یہ ہے کہ ہر آدمی جانتا اور کہتا ہے کہ زمین پر وقفہ زندگی محدود ہے لیکن اس کا عمل اس کے روزمرہ مشاہدہ کے خلاف ہے۔

وہ پوری زندگی ان خطوط پر گزارتا ہے جو قانون فطرت کے خلاف ہے۔ تخریب کا نام اس نے ترقی رکھ دیا ہے۔ دانشور انسان فلاح و بہبود کے طلسمی نام پر مستقبل کی ناخوش گواریوں کو جنم دیتا ہے۔ روشن نگاہی کا دعویٰ کر کے جو کچھ کرتا ہے وہ کوتاہ اندیشی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

سبحان اللہ کی خوب منظر نگاری ہے ایٹم بم کو ترقی کا نام دے کر انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا فلاح و بہبود کے دعویداروں نے ایک ایٹم بم کو لاکھوں قیمتی جانوں پر فضیلت بخش دی ہے۔ انسان قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں کا امین ہے لیکن اس نے ان صلاحیتوں کو حرص و ہوس، خود غرضی، انا پرستی اور خود نمائی جیسے جذبات کی تسکین کے لئے اپنی ذات تک محدود کر دیا ہے لیکن اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتا کہ فانی دنیا کے اعمال بھی فانی ہیں۔ اگر اعمال میں تعمیر ہے تو اعمال یہاں اور آخرت میں جزا ہیں اور اگر اعمال میں تخریب ہے تو اس دنیا اور آخرت کی دنیا میں سزا ہے۔ جب وہ دنیا میں تخریب بوتا ہے تو تخریب ہی کاٹتا ہے۔

دعا گو

عظیمی

۱۳ مئی، ۱۹۸۱ء

D-1/7-1، ناظم آباد، کراچی

محترم ومکرم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

نظر ایک ہے پھر دیکھنے کی طرزیں دو کیوں ہیں۔۔۔۔۔

حقیقی نظر کیا ہے۔۔۔۔۔

دیکھنے کے قانون کی وضاحت فرمادیجئے۔

شکریہ

اقبال بیگم

برخورداری اقبال بیگم

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

دیکھنے کی دو طرزیں ہیں۔ایک طرز یہ ہے کہ فرد کسی چیز کو آنکھ کے ذریعہ دیکھ رہا ہے اور محسوس بھی کر رہا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں لیکن اللہ کے نزدیک یہ دیکھنا فی الواقع دیکھنا نہیں ہے۔اس کی توجیہہ یہ ہے کہ جب ہم نظر اٹھاتے ہیں تو کسی چیز کے اوپر ہماری نظر ٹھہرتی ہے اور ہم کہتے ہیں کہ یہ فلاں چیز ہے،اس کو ہم دیکھنا کہتے ہیں۔

ہم جب نظر دیوار کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو نظر دیوار سے ٹکرا کر واپس آتی ہے اور ہمارے دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ یہ دیوار ہے اور ہم دیوار کو دیکھ رہے ہیں لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ اگر ہم دیوار کے اوپر نظر کو پانچ دس منٹ اسی طرح مرکوز کر دیں کہ آنکھ کے ڈیلے ساکت ہو جائیں اور ان پر پلک کی ضرب نہ پڑے یعنی پلک جھپکنے کا عمل رک جائے تو ہماری آنکھوں کے سامنے سے دیوار غائب ہو جاتی ہے۔یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے،ہر شخص یہ تجربہ کر سکتا ہے۔

اسی طرح جب ہم دائرہ بناتے ہیں اور اس پر نظر جماتے ہیں تو اس وقت بھی یہی صورت پیدا ہوتی ہے کہ دائرہ نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔دائرہ پر نظر قائم ہو جاتی ہے تو پہلے ایک کے دو دائرے بنتے ہیں اور جب مرکزیت میں قیام واقع ہو جاتا ہے تو دائرہ کے اندر خلا پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔۔اور خلا کے اندر روشنی

کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔اسی طرح جب ہم چراغ کے اوپر نظر جماتے ہیں تو چراغ کی لو غائب ہو جاتی ہے اور وہاں ہم ایک دودھیا، نیلے یا سبز رنگ کی روشنی کی مشاہدہ کرتے ہیں۔ صرف مثالیں پیش کرنا مقصد نہیں، عرض یہ کرنا ہے کہ نظر کی مرکزیت کے بعد وہ چیز ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ چیز کہاں چلی جاتی ہے اور اگر یہ چیز نظروں کے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے تو ہم عام حالات میں کیا دیکھتے ہیں۔۔۔۔ظاہر ہے کہ ہم وہ دیکھتے ہیں جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اس لئے کہ حقیقت نہ تبدیل ہوتی ہے اور نہ غائب۔۔۔۔۔ہمارا دیکھنا، آنکھ کا دیکھنا ہوتا ہے اور آنکھ کے دیکھنے کا قانون یہ ہے کہ پلک کی ضرب جب آنکھ کے ڈیلے کو متاثر کرتی ہے تو آنکھ دیکھی ہوئی چیز کی اطلاع دماغ کو فراہم کرتی ہے لیکن اگر پلک جھپکنے کا عمل معطل ہو جائے تو وہ چیز نظر کے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے۔

دیکھنے کی دوسری طرز یہ ہے کہ ہم اپنے اندر دیکھ رہے ہیں یعنی کسی چیز کے عکس کو اپنے اندر مشاہدہ کر رہے ہیں، یہی دیکھنا دل کی آنکھ کا دیکھنا ہے۔دل کی آنکھ وہ چیز ہے جس کا حصول کسی شخص کو مومن کے درجہ پر فائز کرتا ہے۔

اس طرز کو حاصل کرنے کے لئے مراقبہ کیا جاتا ہے۔اس طرح کہ آدمی آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے اور آنکھوں پر کوئی ایسا کپڑا باندھ لے جس سے آنکھوں کے پپوٹوں پر ہلکا سا دباؤ رہے۔پپوٹوں پر دباؤ ڈالنے سے مقصود یہ ہے کہ پپوٹوں اور ڈیلوں کی حرکت ساکت ہو جائے۔ جیسے ہی پپوٹوں کی حرکت ساکت ہوتی ہے، دیکھنے کی طرز بدل جاتی ہے۔

تصوف میں یہ بات نہ صرف ذہن نشین کرادی جاتی ہے بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کرایا جاتا ہے کہ ہر چیز انسان کے اندر موجود ہے۔اللہ کے نزدیک مسلمان اور مومن میں فرق ہے۔ مومن اللہ کے قانون کے مطابق وہ ہے جو تفکر کے بعد غیب کا مشاہدہ کرے اور جس کی طرز فکر میں تفکر نہیں ہوگا، اس کے لئے غیب کا مشاہدہ زیر بحث نہیں آتا۔قرآن پاک میں اللہ نے جگہ جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ تفکر کرو، غور و فکر کرو اور اللہ کی نشانیوں کو پوری ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرو۔روحانیت کا در حقیقت منشا یہی ہے کہ انسان کے اندر تفکر کی طرزوں کو پیدا کیا جائے اور مستحکم کیا جائے۔یہ نکتہ قابل غور ہے کہ مسلمان اور مومن میں فرق ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہے

یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، ان سے کہو تم ایمان نہیں لائے

بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوئے ہیں۔ایمان ابھی تمھارے دلوں

میں داخل نہیں ہوا ہے۔الحجرات: ۱۴

بات یہ ہے کہ ایمان کا منشا یقین ہے۔۔۔۔یقین کا منشا مشاہدہ ہے۔اللہ تعالی یہ بھی فرماتے ہیں

ہم نے آسمان کو بروج بنایا اور دیکھنے والوں کے لئے اسے

زینت بخشی اور شیطان مردود سے محفوظ کر دیا۔الحجر:۱۶۔۱۷

مطلب واضح ہے کہ شیطنت کے مرتکب لوگ اللہ کے بروج کی زینت نہیں دیکھتے۔

دعا گو
عظیمی

۹،مارچ ۱۹۸۲ء

1-D-1/7 ،ناظم آباد۔کراچی

محترم ومکرم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

موجودہ دور میں سائنسی ترقی اپنے عروج پر ہے لیکن اس کے ساتھ بے سکونی اور نفسیاتی الجھنوں کا تناسب بھی انتہا پر ہے۔ایسے میں روحانی ہستیوں کی خدمات قابل قدر ہیں کہ وہ سکون سے ناآشنا لوگوں کی الجھنوں کا سدباب کرتے ہیں اور انہیں زندگی گزارنا سکھاتے ہیں۔میرا سوال یہ ہے کہ زمان ومکان کیا ہیں اور مادی اجسام کا ربط کس بساط پر ہوتا ہے۔براہ کرم راہنمائی فرمایئے۔

شکریہ

نیازمند۔عدنان عادل

عدنان عادل صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

موجودہ دور میں حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی نگاہ حقیقت بیں وزمانہ شناس نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی تو انہوں نے روحانی علوم کو تمام تر حقیقتوں اور سچائیوں کے ساتھ عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ان کی عارفانہ نگاہ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مادی ترقی کے اس عروج کے بعد جو ماحول پیدا ہوگا اس میں انسان روحانی سچائیوں اور اپنے خالق کی تلاش میں ضرور سرگرداں ہوگا۔چنانچہ انہوں نے اس امر کو ضروری سمجھا کہ انسان کے ایمان کی پیاس کی تشنگی کے لئے حقیقت اور سچائی پر مبنی رموز کو واضح انداز میں بیان کر کے آنے والوں کے لئے بھی محفوظ کر دیا جائے۔آپ کتاب ''لوح وقلم'' میں فرماتے ہیں،

مستقبل کے خوفناک تصادم چاہے معاشی ہوں یا نظریاتی،
نوع انسانی کو مجبور کر دیں گے کہ وہ بڑی سے بڑی قیمت
لگا کر اپنی بقاء تلاش کرے اور بقاء کے ذرائع قرآنی
نظام توحید کے سوا کسی نظام حکمت میں نہیں مل سکتے۔

آج کے حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بات کس قدر سچ ثابت ہو رہی ہے۔اب آیئے زمان اور مکان کے قانون کی طرف۔تمام اجسام نسمہ کی حرکات کا مجموعہ ہیں اور نسمہ کی لکیریں ہی تمام مادی اجسام میں آپس کے رابطہ کا کام کر رہی ہیں۔یہ لکیریں کیا ہیں۔۔۔۔لکیریں مفرد اور مرکب حرکت کا

مجموعہ ہیں۔ نسمہ کی یہ حرکت جب مفروضع پر رہتی ہے تو یہ اکہری حرکات پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان حرکات کے مجموعہ میں جتنے بھی نقش و نگار بنتے ہیں وہ جنات یا جنات کی دنیا ہیں اور جب یہی حرکات تانے اور بانے کی طرح ایک دوسرے کی مخالفت میں حرکت کرتی ہیں تو ان سے جو نقش و نگار بنتے ہیں، اسے انسان یا انسان کی دنیا کہا جاتا ہے۔ اب اس کے بعد بھی دو درجے ہیں۔ جب تک یہ حرکات غیر محسوس درجہ میں رہتی ہیں تمثل کہلاتی ہیں۔۔۔۔۔ نظر نہیں آتیں اور جب یہ حرکات محسوس دائرہ میں آجاتی ہیں تو جسم کی شکال اختیار کر لیتی ہیں جو مادیت یا مشاہدہ بن جاتی ہیں۔ پہلے مرتبہ کا نام ''عالم ارواح'' اور دوسرے مرتبہ کا نام '' عالم مثال'' ہے۔

دعا گو

عظیمی

۳۱، مارچ ۱۹۸۳ء

1-D-1/7 ، ناظم آباد۔ کراچی

بنام اراکین سلسلہ عظیمیہ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

جان سے زیادہ عزیز دوستوں، سلسلہ عظیمیہ کے درخشندہ ستاروں، مخلص بہن بھائیوں! سب میری روح کا نور اور قلب کا سرور ہیں۔

حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے دلارو، آپ سب میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا قرار ہیں۔

مجھے آپ سے جدا ہوئے ایک ماہ چھ روز ہو گئے ہیں۔ آپ کی من موہنی صورتیں میرے سامنے رہتی ہیں۔ آپ کی یاد، بے چینی، اضطراب اور تعلق خاطر میرے روح کو مضراب بن کر چھیڑتے رہتے ہیں۔ آپ اس فقیر کو جس قدر یاد کرتے ہیں، فقیر بھی روح کی گہرائیوں سے آپ کو یاد کرتا ہے۔ کئی دوست جو اس محفل میں موجود ہیں میری جدائی نے بلاشبہ انہیں نڈھال کر دیا ہے۔ کئی دوست جو اس محفل میں موجود نہیں ہیں، ابھی تک یاد، محبت اور عشق کے فلسفہ میں گم ہیں۔

پیارے دوستوں! آپ کو معلوم ہے، مرشد کریم حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے فیض اور تصرف سے اس فقیر کو نعمتیں نصیب ہیں، اللہ کا کرم اور حضور سرور کائنات ﷺ کی رحمت ہے۔ میں یہاں بچوں اور آپ سب سے دور آپ کی یاد کے سہارے اس لئے آیا ہوں کہ حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کا مشن دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائے۔

میں آپ سے پیار کرتا ہوں، آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ محبت کیا ہے، اللہ کا نور ہے۔ ہم جب ایک دوسرے کو یاد کرتے ہیں تو دراصل نور۔۔۔۔ نور سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کی تلاش میں نکلے ہیں حقیقت یہ ہے کہ نور بندہ کو عرفان بن کر اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے

اول ما خلق اللہ نوری

اللہ نے کائنات کا ظہور چاہا تو پہلے حضور پاک ﷺ

کا نور تخلیق کیا اور اپنے محبوب ﷺ کو رحمت اللعالمین

بنا دیا۔

دوستوں! یہ ساری کائنات جذب و مستی، حسن و عشق اور رحمت و محبت پر قائم ہے۔ اللہ کی یہ صفت اس طرح جاری ہے کہ اللہ کے محبوب ﷺ، اپنے دوستوں (اولیاء اللہ) پر فریفتہ ہیں اور اللہ کے محبوب ﷺ کے دوست اپنے دوستوں پر فدا ہیں۔ یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابدالاباد تک قائم رہے گا۔

عزیز ساتھیوں !آپ کے دل دھڑکنیں، میں یہاں بیٹھے ہوئے سنتا ہوں۔ میں جب آپ کی آنکھوں میں شبنم کے موتی دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں سے دریا بہہ نکلتا ہے۔ حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے واسطہ سے ہم سب یک جان دو قالب ہیں۔آپ کی روح میں جلترنگ، حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ سے قائم ہے۔۔۔۔ ہمیں اس قندیل کو روشن رکھنا ہے۔

وارث فخر کائنات ابدال حق حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے روحانی مشن کو دنیا کے اِس کونے سے اُس کونے تک پہنچانے کے لئے ہمیں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہادینا ہے۔ باباصاحب رحمتہ اللہ علیہ محبت کا پیکر ہیں، مخلوق خدا کے لئے رحمت ہیں۔ ہم سب ان کے جانثار غلام ہیں۔ ہم ان کی محبت کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ محبت میں خوف، غم اور دوری نہیں ہوتی۔ محبت کا درس آپ کے اندر شروع ہو چکا ہے۔ لطیفوں کی رنگینی کی سرشاری ہمارا مقدر بن چکی ہے۔

آیئے عہد کریں کہ محبت کا درس اپنے گھر سے شروع کریں گے ،اللہ کی مخلوق کو عزیز رکھیں گے اور رسول پاک ﷺ کی صفت " رحمت العالمین" کو اپنے اوپر نافذ کریں گے۔

میرے پیاروں ! میں آپ کا روحانی استاد، دل و جان سے آپ کا ہمدرد، آپ کو سلام کرتا ہوں کہ آپ گلستان جنت کے پھول ہیں۔ یاد رکھئے ! ان پھولوں کی خوشبو سے کہکشانی نظام مہک اٹھیں گے۔آپ اللہ سے توفیق مانگتے رہئے اور مراقبہ میں دانستہ کوتاہی نہ کیجئے۔

عزیزوں ! میں نے آپ کی جدائی اس لئے برداشت کی ہے کہ برصغیر سے پھوٹنے والی خوشبو مغربی ممالک میں رہنے والوں کو بھی مسحور کردے۔ الحمدللہ، دن رات کی مصروفیت نے کامیابی کا دروازہ دکھادیا ہے۔ برطانیہ کے ۱۷ یا ۱۸ شہروں میں حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے روحانی علوم کی خوشبو بکھیر آیا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ یہاں سے ایک طوفان اٹھے اور نوع انسانی سکون آشنا زندگی سے مانوس ہو جائے۔آپ سے اور سلسلہ کے ہر فرد سے کامیابی و کامرانی کے لئے درخواست ہے۔

اپنے گھروں میں بیگمات کو سلام کہیں اور پیارے بچوں کو دعائیں۔ محفل مراقبہ میں حاضرین کو سلام، دعائیں۔

آپ کے لئے دعا گو

آپ کا خدمت گزار

خواجہ شمس الدین عظیمی

محترم و مکرم مرشد کریم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

احساس پچھتاوا بن گیا ہے کہ زندگی گزر گئی اور میں روحانیت میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکا۔ عمر ساٹھ سال کے قریب ہے۔ اس سے زیادہ جینے کی آرزو نہیں اس لئے کہ دو جہاں کے تاجدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مادی دنیا میں تریسٹھ سال حیات پسند فرمائی۔ اب تک گزری زندگی کا تجزیہ کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ سب خسارہ ہے کیا میرے لئے راحت کا کوئی امکان نہیں۔۔۔۔۔

نیاز مند

ڈاکٹر محمد سلیمان خان

میرے رفیق، میرے دوست، برادر جان برابر، دل کی آئینہ میں مکین، ڈاکٹر محمد سلیمان خان صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

آپ کیا ہیں، کیا نہیں ہیں، یہ سوچنا آپ کا کام نہیں۔ آپ کو کتنا عرصہ اس قید و بند کی دنیا میں سانس لینا ہیں، یہ بات بھی ایسی ہے کہ جو کسی کو نہیں بتائی گئی ہے۔

جو بات اللہ مخفی رکھنا چاہتے ہے، بندہ کو اس بارے میں تردد نہیں ہونا چاہئے

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کو بخار نے پریشان کیا تو انہوں نے اللہ سے درخواست کی کہ بخار سے نجات مل جائے۔ اللہ نے فرمایا، بایزید! تو بھی ہمارا، بخار بھی ہمارا۔۔۔۔۔

یہ جذبہ بہت اعلیٰ اور خوبصورت ہے کہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر سے زیادہ زندہ نہیں رہنا چاہئے لیکن یہ ایثار کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے کہ اللہ تعالیٰ۔۔۔۔۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مشن کو چلانے کے لئے ہمیں منتخب کر لیں۔ ہم بار بار مریں اور پھر زندہ ہوں اور اپنے آقا ﷺ کے مشن کے لئے زندگی کو شمع کی طرح پگھلاتے جھومتی اور شمع کے خون کا ایک ایک قطرہ لوبن کر روشنی پھیلاتا رہے۔

ابدال حق حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کا مشن ہے کہ

تڑپتی، سسکتی، بے حال اور درماندہ مخلوق کو سکون سے آشنا،

کیا جائے۔ شیطانی گرفت سے نجات دلائی جائے،

مادیت کے دبیز پردوں سے آزاد کر کے اس کے اوپر

غیب کی دنیا کے دروازے کھول دیئے جائیں اور یہ

مشاہدہ ہو جائے کہ اس کا اصل مقام جنت ہے۔ وہ

مقام جہاں زمان و مکان نہیں، جہاں آرام و آسائش اور

سکون کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

میرے پیارے دوست! اللہ تعالیٰ آپ کو میری خواہش کے مطابق روحانی ترقی عطا فرمائیں۔ آپ بالکل دل گرفتہ نہ ہوں۔ جو کام آپ کے سپرد کیا گیا ہے کرتے رہیں، جن کا کام ہے وہ خود انجام کو پہنچائیں گے۔ ہم سب کٹھ پتلی ہیں۔۔۔۔ تار جس طرح ہلائے جاتے ہیں ہم حرکت کرتے ہیں۔ جب ہم اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوئے۔۔۔۔ اپنی مرضی سے قیامت تک زندہ نہیں رہ سکتے۔۔۔۔ سانس لینے پر اختیار نہیں ہے۔۔۔۔۔ تو پھر صحیح بات یہی ہے کہ کٹھ پتلی کی طرح حرکت کریں۔

عزیز گرامی قدر قریشی صاحب کو بہت سلام کہئے۔ صوفی صاحب کو بھی سلام کہہ دیجئے۔ بچوں کو دعائیں۔ سلسلہ کے تمام احباب کو سلام و دعا۔ محفل مراقبہ میں سب دوستوں کو سلام عرض کر دیں۔

دعا گو

عظیمی

۲۷، اکتوبر ۱۹۸۳ء

نیلسن۔ انگلینڈ

عزت مآب عالی مقام استاد محترم

السلام وعلیکم ورحمتہ اللہ

اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔آمین

قرآن کریم تخلیقی فارمولوں کی دستاویز ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اس میں ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہے نہ زمین میں۔نہ ذرہ سے بڑی نہ اس سے چھوٹی۔سب کچھ کتاب مبین میں درج ہے۔(۳:۳۴)

موجودہ ترقی غیر مسلم اقوام کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔اس بات پر جتنا سوچتا ہوں ذہن پر دباؤ بڑھنے لگتا ہے کہ غیر مسلم اقوام کے پاس کیا رہنمائی ہے کہ آج وہ عروج پر ہیں۔

آپ کا روحانی فرزند

ڈاکٹر مظفر عظیمی

محترم ڈاکٹر مظفر صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

قرآن نے غور فکر اور ریسرچ (تجسس و تحقیق) کو ہر مسلمان کے لئے ضروری قرار دیا ہے چناچہ کائنات کے انتظام وانصرام کے لئے جو قوانین جاری وساری ہیں تو ان کو جاننا ہر ذی شعور مسلمان کا فرض ہے،اس لئے کہ اللہ کی نشانیوں میں تفکر اور تدبر کے نتیجہ میں سائنسی حقائق کا مشاہدہ،صاحب تفکر کو اللہ کی ذات پر ایمان لانے پر مجبور کر دیتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے

۔حکمت سیکھو جہاں سے بھی ملے

۔حکمت مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے،جہاں کہیں اس کو پائے اٹھالے

۔ایک ساعت کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے

۔طلب علم بہترین عبادت ہے۔

۔علم اسلام کی حیات اور اسلام کا ستون ہے

۔ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر علم سیکھنا فرض ہے

۔جو شخص دنیاوی فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ علم حاصل کرے، جو شخص اخروی متاع حاصل کرنا چاہتا ہے، قرآن کریم رہنمائی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے

۔علم سیکھو چاہے تمھیں چین جانا پڑے

رب العالمین کے فرستادہ، رحمت العالمین علیہ الصلوٰۃ السلام کے ارشادات اور دعوت علم کا اثر یہ ہو کہ امتی پوری توجہ اور جذب و شوق کے ساتھ علم حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ جہاں سے بھی علم حاصل ہو سکتا تھا حاصل کیا اور علم کی فضیلت نے علوم و فنون میں کرۂ ارض پر قائد اور رہنما بنا دیا۔ مسلمانوں نے اپنے علوم کی بنیاد اوہام پرستی، قیاس آرائی اور مفروضہ باتوں پر نہیں رکھی بلکہ ہر میدان میں تجربہ اور مشاہدہ کی بناء پر نئی نئی تحقیقات کیں جس کے نتیجہ میں مسلمان طبیب، ہئیت دان، جابر، فارابی، زکریا، ابن سینا، خوارزمی، عمر خیام، نصیر الدین طوسی، ابن الہیثم، ابن محمد قزوینی، رازی، ابوالقاسم زہراوی، ابوریحان البیرونی، ابن خلدون، امام غزالی رحمتہ اللہ وغیرہ پیدا ہوئے اور انہوں نے محنت اور تحقیق سے سائنسی علوم میں غیر معمولی اضافہ کیا۔

مسلم ماہرین علم نے بنی نوع انسان کے علم میں نہایت اہم اضافے کئے۔ ان نامور مصنفین کی تصنیفات پڑھ کر موجودہ زمانے کا تعلیم یافتہ شخص ان کتابوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بیان کرتا ہے کہ ان میں کہیں بھی اسلامی عقائد کے ساتھ تضاد اور مخالفت نہیں پائی جاتی۔ کسی جگہ بھی اسلام اور سائنس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

آج کا غیر متعصب دانشور جب تخلیق کائنات اور تخلیقی اسرار و رموز پر غور کرتا ہے اور اس سوچ بچار اور تفکر کو آسمانی کتاب قرآن پاک سے ملاتا ہے تو یقینی اور حقیقی ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ تحقیق و تلاش انسان کی پیدائشی خاصیت ہے۔ دانشور جب تحقیق و تلاش کے صحیح مقام کا تعین کرتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ سائنس دراصل تخلیق و تسخیر اور موت و حیات کی حقیقت اور اس کے تمام رازوں تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

قرآن کریم میں اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آدم کو اپنی نیابت عطا کی اور اس کو سارے نام سکھا دیئے۔ نیابت سے مراد اللہ کے خصوصی اختیارات کا استعمال ہے۔ خصوصی اختیارات کے استعمال کا سوال اسی وقت زیر بحث آتا ہے کہ جب اختیارات استعمال کرنے کے قواعد اور قوانین سے واقفیت حاصل ہو۔ اختیارات کے قوانین کے استعمال سے باخبر کرنے کے لئے اللہ نے آدم کو علم الاسماء سکھایا۔ اس سے مراد یہی ہے کہ آدم کو تسخیر کائنات کی سائنس سکھا دی گئی تاکہ وہ اس خصوصی علم کے ذریعے کائنات پر حکمرانی کر سکے۔

علمی اعتبار سے سائنس کا علم فطرت اور کائنات کا علم ہے۔ سائنس کا مقصد ہے کہ کائنات کے افراد اور افراد کے اجزائے ترکیبی کی تخلیق و ترکیب اور مقداروں کا پتہ چلے جو ایک ضابطہ کے ساتھ متحرک ہیں۔ حرکت ہر شے کی زندگی ہے۔ علمی طور سے سائنس کا منشا تسخیر کائنات کی صلاحیت کو بیدار اور متحرک کرنا، زمین اور آسمان کے خزانوں سے استفادہ کرنا ہے۔

ایک وقت تھا کہ یورپ علم کے میدان میں خالی ہاتھ تھا۔ وہاں جہالت اور اندھیروں کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ مسلمان چونکہ نبی آخر الزماں ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا تھا اس لئے وہ من حیث القوم ممتاز تھا اور جیسے ہی وہ نبی آخر الزماں ﷺ کی تعلیمات، فکر و تدبر اور تحقیق و ترقی کے علوم سے دور گیا اسی مناسبت سے اس کی زندگی انفرادی طور پر اور من حیث القوم جہالت اور تاریکی میں ڈوبتی چلی گئی اور جس قوم نے علم کے حصول اور سائنسی ترقی کو اپنے لئے لازم قرار دے لیا وہ بلند اور سرفراز سمجھی جانے لگی۔

یہ اللہ کا قانون ہے۔۔۔۔ جو قوم اپنی حالت نہیں بدلتی اللہ اس کی حالت تبدیل نہیں کرتا۔ سیدنا حضور ﷺ کے ارشادات گرامی کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کائنات میں پھیلی ہوئی نشانیوں میں تفکر کریں اور تحقیق و تلاش کے شعبہ میں ترقی کر کے باشعور قوم بن جائیں۔

پشاور مراقبہ ہال میں سب دوستوں کو، والد صاحب کو اور والدہ کو میرا اسلام عرض کریں۔۔۔۔ عرس کے مبارک موقع پر تشریف لائیں، بہت خوشی ہو گی۔

دعا گو

عظیمی

۱۰، فروری ۱۹۸۴ء

1-D-1/7، ناظم آباد۔ کراچی

محترم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

کیا کائنات میں کوئی شے حیات کے بغیر موجود ہے، اگر موجود ہے تو کس طرح قائم ہے۔۔۔۔سائنس جن چیزوں کو غیر جاندار کہتی ہے، کیا وہ جاندار نہیں ہیں۔شکریہ۔

عمادالدین

عزیزالقدر عمادالدین صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

اللہ تعالیٰ آپ کو دین اور دنیا کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے، آمین۔

اب سے صدیوں پہلے یا موجودہ دور کی سائنسی ایجادات ہو۔۔۔۔مخفی صلاحیتوں کے استعمال کا مظاہرہ ہیں۔انسان مخفی صلاحیتوں کو بیدار کر کے کسی شے میں خواہ وہ ایٹم ہی کیوں نہ ہو تفکر کرتا ہے تو اس کے اوپر شے کے اندر چھپی ہوئی قوتوں کو انکشاف ہوتا ہے۔۔۔۔ہر ترقی اور موجودہ سائنس اسی ضابطہ اور قاعدہ پر قائم ہے۔

کسی بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے غیر جانبدار ہونا

ضروری ہے۔غیر جانبدار ذہن نہ ہونے سے معنی

پہنانے میں مصلحتیں شامل ہو جاتی ہیں۔

ہر شخص کو طرز فکر کے دو زاویے حاصل ہیں، ایک یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کو سامنے رکھ کر غور و فکر کرتا ہے۔جو بندہ اپنی ذات کو سامنے رکھ کر تجسس کرتا ہے اس کے اوپر حقائق منکشف نہیں ہوتے اور جو بندہ غیر جانبدار ہو کر گہرائی میں غور و فکر کرتا ہے، اس کے اوپر حقائق منکشف ہو جاتے ہیں۔

ارسطو کے زمانے سے لے کر گزشتہ صدی کے وسط تک لوگ اس بات کے قائل رہے ہیں کہ حیات، جاندار مادوں کے علاوہ بے جان چیزوں سے مل کر بھی پیدا ہوتی ہے۔ارسطو نے اپنی کتاب ہسٹوریا انیمالیم (Historia Animalium) کی چوتھی جلد کے پندرہویں باب میں لکھا ہے، عام طور

پر مچھلیاں انڈوں سے پیدا ہوتی ہیں لیکن ایسی مچھلیاں بھی ہیں جو ایک خاص ماحول کے تحت کیچڑ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔۔۔ارسطو کے بعد دو ہزار سال تک یہ نظریہ تسلیم کی جاتا رہا لیکن محققین کے مشاہدات اور تجربات اس نظریہ کو ثابت نہیں کر سکے اس لئے مسترد کر دیا۔ پھر دوسرا نظریہ جسے " حیات سے حیات کا نظریہ (Biogenesis) " کہا جاتا ہے اپنا لیا گیا۔ اس کے مطابق حیات کبھی غیر جاندار چیزوں سے مل کر پیدا نہیں ہوتی۔

کیمیا (Chemistry) کی تاریخ میں قانون بقائے مادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس قانون کی رو سے مادہ کسی بھی کیمیائی تعامل (Chemical Reaction) کے دوران پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی فنا کیا جا سکتا ہے۔ عرصہ تک اسی نظریہ کو تسلیم کیا جاتا رہا۔ ہر نامور محقق نے اس نظریہ کو صحیح ثابت کیا لیکن محقق آئن سٹائن نے بتایا کہ مادہ فنا کیا جا سکتا ہے۔ آئن سٹائن کا نظریہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ مادہ کی رفتار روشنی کی رفتار کے برابر ہونے سے مادہ توانائی میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

آئن سٹائن نے یہ بھی بتایا کہ حرکت کے دوران اجسام کی رفتار کے مطابق ان کی کمیت (Mass) میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے لیکن آئن سٹائن نے اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے کوئی تجربہ یا مشاہدہ پیش نہیں کیا۔ نظریہ اضافت (Theory of Relativity) کو ہر سائنسدان نے تسلیم کیا۔ یہ کہانی ہے آج کے دور کے علوم کی۔۔۔۔جن کی بنیاد پر بے پناہ ترقی ہوئی ہے۔

سوال یہ ہے۔۔۔کیا کوئی ایسا فارمولا ہے جس کو بنیاد بنا کر ہم اس حقیقت تک پہنچ سکیں کہ حیات کیا ہے اور اس فارمولے کو مسترد نہ کیا جا سکے۔۔۔میری زندگی کا ہر لمحہ حیات ہے لیکن زندگی کے دوسرے لمحہ میں پہلا لمحہ مر جاتا ہے۔ اب ہم یوں کہیں گے کہ جس طرح حیات کو امر مسلمہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح فنا بھی حقیقت ہے۔ یعنی حیاتیاتی قانون یہ بنا کہ حیات سے حیات پیدا نہیں ہو رہی بلکہ فنا سے حیات اور حیات سے فنا تخلیق ہو رہی ہے۔ یہ حقیقت اس طرح بھی بیان کیا جا سکتی ہے کہ فنا اور حیات دونوں حقیقت ہیں۔ جب ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ فنا اور حیات دونوں زندگی ہیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ فنا ہی دراصل حیات ہے۔ میری آج کی زندگی کے موجودہ لمحہ پر فنا وارد نہ ہو تو میں اگلے مرحلہ میں داخل نہیں ہوتا۔ بچہ پنگھوڑے میں سے باہر نہیں آئے گا اگر اس کی زندگی فنا سے گزر کر اگلے مرحلہ میں داخل نہ ہو۔ حیاتیاتی محققین نے جو کچھ کہا ہے وہ فنا سے حیات اور حیات سے فنا کے نظریہ کے مطابق نہیں ہے۔

مثال: ہم مادی جسم کے ساتھ پیدا ہوئے، نشو و نما پا کر جوان ہوئے، مضبوط اعصاب پر بڑھاپا طاری ہوا اور پھر ہم نابود ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ ایک دن کا بچہ، ایک سال کا بچہ، اٹھارہ سال کے جوان اور ساٹھ سال کے بزرگ کی حیات کو کون نگل گیا۔ وہ کہاں اور کیوں روپوش ہو گئی۔۔۔۔یہ ضروری کیوں نہیں ہے کہ ہم ساٹھ سالہ تجرباتی زندگی کو تلاش کریں۔۔۔۔ساٹھ سال جس کے۔۔۔۔

اکیس ہزار نو سو۔۔۔دن۔۔۔۔

پانچ لاکھ پچیس ہزار چھ سو۔۔۔۔۔گھنٹے۔۔۔

تین کروڑ پندرہ لاکھ چھتیس ہزار۔۔۔۔۔منٹ اور

ایک ارب نواسی کروڑ اکیس لاکھ ساٹھ ہزار۔۔۔۔۔ سیکنڈ ہوتے ہیں۔

کیسے ممکن ہے اتنا طویل وقفہ ہم نظر انداز کر دیں۔۔۔۔۔ محققین نظریات کی روشنی میں نوع انسانی کو یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ حیات کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ سائنسی نظریہ یا تو تبدیل ہو جاتا ہے یا مسترد کر دیا جاتا ہے۔ کوئی نظریہ اس وقت حقیقی ہے جب وہ تبدیل اور مسترد نہ ہو۔ حیات سے متعلق تبدیل نہ ہونے والا اور کسی بھی صورت میں جس نظریہ کو مسترد نہ کیا جا سکتا ہو، اس کی نشاندہی آخری الہامی کتاب قرآن کریم میں ہے۔ قرآن کریم اور آسمانی کتابوں کے مطابق حیات دو طرح کے حواس پر قائم ہے۔ ایک طرح کے حواس مفروضہ ہیں۔ ان حواس میں جب بھی کوئی فیصلہ کیا جائے گا مفروضہ اور فکشن ہو گا۔

فی الواقع حیات کی اصل فنا ہے۔ زندگی فنا سے نکلتی ہے اور فنا زندگی بن رہی ہے۔ یہ کہنا ہے کہ حیات کبھی غیر جاندار چیزوں سے مل کر پیدا نہیں ہوتی، مفروضہ حواس کی کارفرمائی ہے، اس لئے کہ جن چیزوں کو بے جان کہہ کر نظر انداز کیا جاتا ہے وہ بھی حیات ہیں۔ مشاہدات ثابت کرتے ہیں کہ کائنات میں کوئی وجود زندگی کے بغیر موجود نہیں ہے۔ اب یہ کہنا کہ کائنات میں کوئی شے حیات کے بغیر بھی موجود ہے، دلیل کے ساتھ سائنسی نظریہ کی نفی ہے۔ قانون یہ ہے کہ جب جان سے جان ملتی ہے تو تیسری جان خدوخال بن جاتی ہے۔ حیات و ممات، فنا اور زندگی کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم آخری الہامی کتاب قرآن کریم سے رجوع کریں۔

دعا گو

عظیمی

اگست ۱۹۸۴ء

1-D-1/7، ناظم آباد۔ کراچی

محترم ومکرم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

امید ہے آپ خیریت سے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ جنات اور انسان کی صلاحیتوں میں کیا فرق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک بندہ اپنے عمل کے معنی و مفہوم سے بے خبر ہے تو کیا اسے اس عمل سے فائدہ یا نقصان ہو گا۔

نیاز مند

سرفراز مجید

سرفراز مجید صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ایک بندہ کا تذکرہ ہوا ہے۔ ان تذکروں میں طرز فکر کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں عفریت جن کہتا ہے کہ اس سے پہلے کہ آپ دربار برخاست کریں میں تخت کو حاضر کر دوں گا۔ دوسری طرف بندہ یہ کہتا ہے، میرے پاس کتاب کا علم ہے۔ میں اس علم کے ذریعے اس سے پہلے کہ آپ کی پلک جھپکے تخت آپ کے پاس لے آؤں گا۔ اس واقعہ میں لطیف نکتہ یہ ہے کہ

جن اور انسان میں یہ فرق ہے کہ جن خود کو وقت کے

ساتھ پابند کئے ہوئے ہے لیکن بندہ نے وقت کی نفی کر

دی ہے۔ بندہ کے ذہن کی وسعت لا محدود ہے اور اللہ

لا محدود وسعت کا خالق و مالک ہے۔

اللہ نے انسان کو وہ علم دیا ہے جو فرشتے نہیں جانتے۔ یہ بندہ کتاب کے اس علم کو جانتا ہے کہ بشر پتلہ ہے۔۔۔ پتلہ خلا ہے۔۔۔۔۔ خلا یا بشر میں اللہ کی روح ہے۔۔۔۔ روح اللہ کا امر ہے اور اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

آپ کے دوسرے سوال کے جواب میں آپ سے سوال ہے کہ کیا دنیا کا کوئی بھی علم مفہوم سمجھے بغیر حاصل کیا جا سکتا ہے۔۔۔اگر آپ کو اردو، انگریزی یا عربی پڑھنی آجائے لیکن آپ زبان کے معنی و مفہوم سے واقف نہ ہو، ابھی یہ علم محض Reading کی حد تک ہے تو کیا اس علم سے فائدہ ہوگا۔۔۔کیا انگریزی کو سمجھے بغیر پڑھنے سے نوکری ملتی ہے۔۔۔۔آپ بچہ کو حساب یا طبعیات کا فارمولا یاد کروادیں لیکن اسے فارمولے کا فہم نہ ہو۔۔۔کیا محض پڑھ لینے سے وہ فارمولے کا استعمال سیکھ لے گا۔

موسم بہار میں حضرت رابعہ بصری رحمتہ علیہ سے خادمہ نے عرض کیا، مکان سے باہر آیئے اور خالق کائنات کی صناعی اور قدرت کو ملاحظہ کیجئے۔آپ نے فرمایا، تو اندر کیوں نہیں آجاتی کہ خود خالق حقیقی کو دیکھ لے اور فرمایا میں صرف صنعت کو نہیں۔۔۔خالق کو بھی دیکھتی ہوں۔

لوگوں نے سوال کیا کہ آپ جس ہستی کی عبادت کرتی ہیں کیا آپ اس کو دیکھتی بھی ہیں۔۔۔فرمایا، اگر میں نہ دیکھتی تو عبادت کیسے کر سکتی تھی۔

چند بزرگوں کی ایک جماعت حضرت رابعہ بصری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ایک شخص سے آپ نے پوچھا، تم خدا کی عبادت کس لئے کرتے ہو۔۔۔اس نے کہا، دوزخ کے سات طبق نہایت عظیم ہیں۔ہر ایک کو اس کے اوپر سے گزرنا پڑے گا۔خوف کی وجہ سے عبادت کرتا ہوں۔

حضرت رابعہ بصری رحمتہ علیہ نے فرمایا

بندگی یہ ہے کہ خوف یا لالچ کی وجہ سے نہیں۔۔۔

اللہ کو اللہ کے لئے یاد کیا جائے۔

ان لوگوں نے پوچھا آپ عبادت کیوں کرتی ہیں، آپ اللہ سے کوئی امید نہیں رکھتیں۔۔۔۔حضرت رابعہ بصری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا

ہمارے لئے کافی ہے کہ ہم اللہ کی عبادت اس لئے کریں کہ اللہ خوش ہوتا ہے اور اللہ کی تسلیم و رضا" زندگی" ہے۔

دعا گو

عظیمی

۹، اگست ۱۹۸۴ء

1-D-1/7، ناظم آباد۔کراچی

فرحانہ انجم صاحبہ

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

خواب میں مری ہوئی ٹیچر کا میک اپ کرنا اور ان کے لئے ایک کفن کرنا دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہ کہ آپس میں سہیلیاں ایسی گفتگو کرتی ہیں جو ماورائی دنیا اور ماورائی مخلوق سے متعلق ہیں۔ دوسرے یہ کہ صاحب خواب کے کھانے پینے کے اوقات میں بے اعتدالی ہے جس سے پیٹ میں نقائص پیدا ہو سکتے ہیں، ممکن ہے کہ پیٹ میں کیڑے بھی ہوں۔

خواب دراصل ایک مخفی زبان ہے یہ زبان تعبیر بتانے والے کے ذہن کو جو مفہوم دیتی ہے وہ ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دور پرے کی باتیں بالکل سامنے نظر آجاتی ہیں اور تعبیر بتانے والا شخص ان چیزوں کو اندر کی آنکھ سے دیکھ کر یہ بتا دیتا ہے کہ ایسا ویسا ہے۔ کبھی کبھی اندر کی آنکھ دیکھنے میں صحیح اندازہ نہیں کر سکتی لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ جو کچھ آنکھ دیکھ رہی ہے وہ غلط ہے۔ زمان و مکان میں مغالطہ ہو جاتا ہے یعنی جو چیز یا جو بات چھ مہینہ بعد یا سال بھر بعد ہونے والی ہے اس کے بارے میں یہ تاثر قائم ہو جاتا ہے کہ یہ بات ہو گئی ہے جبکہ وہ کچھ عرصہ کے بعد واقع ہونے والی ہے۔

خواب کی تعبیر کا علم " علم لدنی" کا ایک باب ہے جو

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصی رحمت سے کسی

کو نصیب ہوتا ہے۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ تعبیر بتانے والا بندہ پیغمبر یا نبی ہو۔ جس پر رحمت اللعالمین کے فیض و کرم سے فضل ہو جائے وہ اللہ کا انعام ہے۔

خواب دراصل ہر انسان کا ایک انفرادی عمل ہے ایک آدمی سانپ دیکھتا ہے اس کی تعبیر یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے دشمن کو دیکھا ہے۔ دوسرا آدمی سانپ کو دیکھتا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی شدید بیماری لاحق ہونے والی ہے اور جب تیسرا آدمی اسی سانپ کو خواب میں دیکھتا ہے تو اس کی تعبیر یہ نکلتی ہے کہ اس کو کہیں سے مال و دولت کا خزانہ مل جائے۔ خواب کے بارے میں کسی ایک علامت کو تعبیر کے لئے سند قرار نہیں دیا جا سکتا۔

صاحب خواب جب خواب سناتا ہے یا کاغذ پر تحریر کرتا ہے اور خواب کی تعبیر جاننے والا بندہ ان نقوش کے اوپر جب غور کرتا ہے تو اس کی اندر کی آنکھ کے سامنے ایک پردہ (Screen) ظاہر ہوتا ہے اور جیسے جیسے خواب بیان ہوتا ہے یا تعبیر دینے والا بندہ خواب کے الفاظ پڑھتا ہے، ٹی۔ وی کی طرح اسکرین پر یہ الفاظ نشر ہوتے رہتے ہیں اور جب پورا خواب اسکرین پر لکھا جاتا ہے تو نیچے اس خواب کی تعبیر الفاظ میں ڈھل کر فلم بن جاتی ہے۔ بالکل

اس طرح جیسے ٹی۔ وی اسکرین پر کوئی عبارت اوپر لکھ دی جائے اور نیچے اس کا ترجمہ یا مفہوم لکھ دیا جائے۔ تعبیر دینے والے کا ذہن جتنا یکسو اور مجلّہ ہوتا ہے اسی مناسبت سے ذہن تیز اور بہت تیز کام کرتا ہے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

مئی ۱۹۸۴ء

1-D-1/7، ناظم آباد۔ کراچی

محترم بھائی

رشید صاحب۔۔۔۔۔وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب اصل سے واقفیت ہو،اصل سے

وقوف کے لئے جزئیات کا پورا پورا علم ہونا ضروری ہے۔

اس وقت زیر بحث انسان اور اس کا باطنی وصف ہے۔یہ تجسس فطری ہے کہ انسان کیا ہے۔۔۔۔۔دنیا میں آنے سے پہلے کہاں تھا،اس دنیا تک پہنچنے کے لئے کن منازل سے گزرنا پڑا اور پھر وقت معینہ کے بعد کس دوسری منزل کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کیوں ہے۔۔۔۔نہ خود پیدائش پر مرضی کا انحصار ہے اور نہ کسی طرح موت پر دسترس رکھتا ہے۔آخر وہ کون سا نظام ہے جس کی گرفت اتنی مضبوط اور مستحکم ہے کہ کائنات کی ہر شے مقید اور محکوم نظر آتی ہے۔اس کا حل قرآن کریم کی تعلیم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

کن۔۔۔۔یعنی ایک ہستی نے فرمایا عالم وجود میں آجا جیسا

کہ میرے ارادہ میں ہے۔فیکون۔۔۔۔پس وہ کائنات

موجود ہو گئی،سوچے سمجھے پروگرام اور منشاء کے مطابق۔

تخلیقات ہم سے اور ہمارے پروگرام سے بے خبر

تھیں اور ان پر حیرانی کا عالم طاری تھا۔

جب ہم نے چاہا کہ حیرانی ختم ہو جائے تو ہم نے فرمایا

۔۔۔۔الست بربکم۔اے موجودات!اس بات کا عہد کر کہ

میں تیرا رب ہوں۔۔۔۔قالو بلیٰ۔۔۔۔موجودات یا کائنات

اور انسان نے کہا۔۔۔۔جی ہاں ہم اس بات کا عہد کرتے

ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں۔

عالم موجودات میں جس نے ربانیت اور وحدانیت کا عہد کر کے مخلوق ہونے کا اعتراف کیا تھا،وہی اصل انسان اور اس کا باطنی وصف ہے۔واضح مطلب یہ ہے کہ انسان ازل میں منشاءالٰہی پورا کرنے کا اقرار اور عہد کر چکا ہے۔یہ دیکھنے کے لئے کہ انسان اپنے عہد کو کہاں تک پورا کرتا ہے اسے

مختلف منازل سے گزار کر باطنی وصف کے ساتھ ایک اور ظاہری وصف (جسم) دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا اور ساتھ ہی بے شمار وسائل (مخلوقات) بطور نشانی پھیلا دیئے تاکہ انسان تفکر کے ذریعہ اس بات کو سمجھ سکے کہ جب اس کے استعمال کی کوئی بھی چیز (وسائل) اس قانون سے باہر نہیں کہ ہر شے دو اوصاف سے مرکب ہے تو پھر انسان اس قانون سے مستثنٰی کیسے ہو سکتا ہے۔

جس طرح درخت کا ہر بیج مائیکرو فلم ہے اسی طرح انسان کا مادی جسم باطنی صلاحیتوں کے تابع ہے جنہیں ہم روح کی صفات سے تعبیر کرتے ہیں۔ روح کی حرکت ہی دراصل انسانی حرکات و سکنات کا سبب بنتی ہے اگر کسی وجہ سے یہ حرکت معطل ہو جائے تو زندگی پردہ میں چھپ جاتی ہے۔

مشاہدہ یہ ہے کہ جسم ایک وقت معینہ کے بعد معطل اور بے کار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ جسمانی طور پر اس میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ہر فرد جسم کے اس تعطل کو موت کا نام دیتا ہے یعنی یہ کہ جسم کو حرکت دینے والی شئے نے اس جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے۔ یہی وہ باطنی رخ یا انسان کا باطنی وصف ہے جس کو ہم روح کہتے ہیں۔

حقائق یہ ہیں کہ پیدائش کے بعد انسان کا تعلق تین نظاموں سے ہے۔ پہلا نظام وہ ہے جہاں اس نے خالق حقیقی کو دیکھ کر اس کے منشاء کو پورا کرنے کا عہد کیا۔ دوسرا نظام وہ ہے جس کو ہم عالم ناسوت، دارالعمل یا امتحان گاہ کہتے ہیں اور تیسرا نظام وہ ہے جہاں انسان امتحان کی کامیابی یا ناکامی سے باخبر کیا جاتا ہے۔

کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی ذات اور اس وصف کا عرفان تلاش کرے جس نے اللہ کے روبرو عہد کیا تھا کہ وہ اللہ کے منشاء کو پورا کر کے اللہ کا عرفان حاصل کرے گا۔ رسالت و نبوت اس تعلیم کو تصوف یا طریقت کا نام دے کر ہمارے سامنے ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں۔

من عرف نفس فقد عرف ربہ

حقیقی مقصد (عرفان الٰہی) وہی شخص پا سکتا ہے جو اپنی ذات، باطنی رخ یا روح کے عرفان سے واقف ہو اور یہ جانتا ہو کہ اگر عرفان الٰہی نہ ہو تو وہ انسانیت کے دائرہ میں نہیں ہے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

۱۳، مارچ ۱۹۸۵ء

1-D-1/7، ناظم آباد۔ کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

امید ہے آپ خیریت سے ہیں۔ جاناچاہتی ہوں کہ جب ہر چیز اللہ کی تجلی سے اپنی پوری آن بان سے ساتھ جلوہ فگن ہے تو پھر یہ بگاڑ، شر اور فساد کہاں سے آتاہے اور کیسے پیدا ہوتاہے۔۔۔۔ نیز یہ کہ بگاڑ سے بچنے کا طریقہ کیا ہے تاکہ ہم تجلی سے واقف ہوں۔

شکریہ

فاطمہ حسن

فاطمہ حسن صاحبہ

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

اللہ کی طرف سے دی ہوئی صلاحیتوں کو اللہ کے بخشے ہوئے علم الاسماء کی روشنی میں سمجھنا اور اس کے مطابق دنیا اور کائنات کے امور سرانجام دینا نیابت کہلاتا ہے۔

انسان جب نیابت کے اس درجہ کا ادراک کرلیتا ہے تو اس پر منکشف ہوتا ہے کہ کائنات میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جس کی بنیاد اللہ کے نور پر قائم نہ ہو یعنی کائنات میں جو کچھ ہے اس کا وجود اللہ کے نور سے متحرک ہے۔

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ سورہ النور: ۳۵

قانون کے تحت ہر کام کے لئے ایک ضابطہ مقرر ہے۔ جب شے ضابطہ سے ہٹتی ہے، کسی خرابی یا عدم توجہی کی وجہ سے اس میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو اس روشنی کی رفتار اور فریکوئنسی میں جو کائنات کے محدود سے محدود ترین ذرہ میں گردش کررہی ہے، خلل واقع ہوتا ہے اور ناخوشگوار نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔

مثلاً بجلی کی منفی اور مثبت برقی رو جب تک اصول اور ضابطہ سے بہتی ہے، مفید اور کارآمد نتائج پیدا کرتی ہے اور جب کسی وجہ سے اس میں رکاوٹ پیدا ہو تو قہر بن جاتی ہے جس کو عرف عام میں " شارٹ سرکٹ" کہتے ہیں۔ یہی معاملہ جب اشخاص کی طرف واقع ہوتا ہے تو اسے ناگہانی آفت، قسمت یا تقدیر کہہ کر سوچنے کی راہ بند کرلی جاتی ہے حالانکہ لوح محفوظ کے قانون کے مطابق تجلی جو ہمیشہ خیر ہی خیر ہے، ہر ذرہ میں دور کررہی ہے اور اسے فیڈ کرتی ہے مگر جب فرد جسم کے محدود ترین خول میں تعفن یا کثافت پیدا کرتا ہے تو پھر یہی تجلی بے رخی اختیار کرلیتی ہے۔ تجلی ان قوتوں کی طرف

رجوع کر جاتی ہے جو پاکیزہ اور نفس مطمئنہ کی حلاوت سے باخبر ہیں، خالق کائنات کے انوار سے فیض یاب ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی روشنی دیتے ہیں۔اس طرح خیر کا سرکل جاری وساری رہتا ہے۔

سوال یہ ہے کیا طرز عمل اختیار کریں کہ۔۔۔۔ہمارے اندر کثافت و تعفن پیدا نہ ہو جو خیر کو ہم سے دور کر دیتا ہے اور ہم محروم ومایوس و منتشر ہو جاتے ہیں۔اس کا واحد طریقہ اپنے اندر یقین وایمان ہے۔یقین کا پیڑن جتنا مستحکم ہو گا اسی مناسبت سے ہم اللہ کی معرفت اور حیات وکائنات کی اصل سے واقف ہو سکتے ہیں۔ تفکر طلب یہ ہے کہ یقین اور ایمان کیا ہے۔۔۔۔اگر یقین کی بنیاد ہماری عقل ہے تو پھر بنیاد ناپائیدار ہے۔

سوال یہ ہے کہ روح کیا ہے۔۔۔۔۔اللہ فرماتے ہیں کہ روح ''امر ربی'' ہے یعنی اللہ کی طرف سے براہ راست عطا کی گئی ہے اور یہی وہ پائیدار شے ہے جو واپس اللہ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔اس پر مزید تفکر کیا جائے اور ایمان کی بنیاد اللہ کی عبودیت وحقانیت پر استوار ہو تو یہ وہ گراں بہا عطیہ ہے جس کے ذریعہ اللہ نے اپنی صفات نوع آدم کی عطا کی ہیں اور یہ وہ عطیہ ہے جس نے ہمارا رشتہ کائنات سے جوڑ رکھا ہے۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جسم دراصل ایک عارضی لباس ہے جسے ہم معینہ وقت تک پہنے رہتے ہیں۔اصل وجود وہ ہے جس کی وجہ سے عارضی لباس (جسم) میں حرکت ہے۔

کائنات کی اصل، تعمیر ہے۔ بھلائی اسی میں ہے کہ کائنات کی کنہ سے واقف ہو کر اس کی تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ادا کریں۔ حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ ان بزرگوں میں سے ہیں جنہیں صفات الٰہیہ کی معرفت حاصل ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی بقا کے لئے ان کی تعلیمات کو نہ صرف سمجھیں بلکہ عمل کے ذریعہ ساری دنیا میں پھیلائیں۔

جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکوکاروں سے ساتھ ہے۔العنکبوت:۲۹

قدرت کا کام جاری وساری ہے۔اگر ہم نے یہ کام نہ کیا تو کوئی دوسری قوم ظاہر ہو گی اور یہ کارنامہ ان کے سر رہے گا۔نوع آدم کا مستقبل توحید الٰہی کے نور میں مخفی ہے جس دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی ہے اگر وہ ذرہ نور سے منور ہو جائے تو ایک عالم روشن ہو جائے گا۔آدمی اور انسان کے لئے الٰہی تعلیمات پر غور وفکر کرنا، راہ نجات ہے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

۱۱، دسمبر ۱۹۸۵ء

جناب عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

درخواست ہے کہ آپ یہ بتایئے کہ سورج بینی سے کس قانون کے تحت بینائی ہو جاتی ہے اور چشمہ سے کیونکر نجات مل جاتی ہے۔

محمد ارشد (کراچی)

محمد ارشد صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

سورج کی طرف دیکھنے سے فضا میں جو لہریں گشت کرتی ہیں وہ لہریں آنکھوں کے ذریعے، چہرے کے ذریعے، بالوں کے ذریعے دماغ کے اندر داخل ہوتی ہیں۔

دماغ کے ریشوں میں آنکھوں کے ریشوں میں جو فیکٹریاں عمل کرتی ہیں ان فیکٹریوں کو ان لہروں سے توانائی حاصل ہوتی ہے۔اور وہ توانائی ان کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔

صبح طلوع آفتاب کے وقت فضا میں ایسی توانائی کا ذخیرہ ہوتا ہے جن سے بطور خاص انسانی صحت، حواس، دل و دماغ کی بہت سی قوتیں اور بہت سی صلاحیتیں نمو پاتی ہیں ان صلاحیتوں میں باصرہ کی صلاحیت ہے۔

نکلتے سورج کی سرخ رنگ ٹکیہ کا عکس جب آنکھ کے ریشوں اور عضلات پر پڑتا ہے تو آنکھ کے تمام عضلات اور اعصاب کو خصوصی نشو و نما ملتی ہے اور اس نشو و نما کو سورج کی شعاعیں توانائی بخشتی ہیں۔رفتہ رفتہ یہ توانائی بینائی بحال ہونے کا ذریعہ اور مقام بن جاتی ہے اور آنکھوں پر سے چشمہ اتر جاتا ہے۔سورج بینی کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ نکلتا ہوا سورج ایک منٹ سے زیادہ نہ دیکھا جائے۔

جس جگہ بیٹھ کر سورج بینی کی جائے وہاں کا ماحول صاف ستھرا ہو، فضا میں دھواں یا گرد و غبار نہ ہو۔آسمان اگر ابر آلود ہو تب بھی وقت مقررہ پر مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ جانا چاہئے۔

تجربہ میں یہ بات آتی ہے کہ اگر مسلسل اور متواتر چھ ماہ تک سورج بینی کر لی جائے تو آنکھوں پر سے چشمہ اتر جاتا ہے۔اس کی مثال میں خود ہوں۔اس فقیر نے اپنے پیرو مرشد قلندر باباولیاء رحمتہ علیہ کی اجازت اور نگرانی میں چھ ماہ تک سورج بینی کی تھی جس کے نتیجہ میں آنکھوں پر سے چشمہ اتر گیا تھا۔اس علاج کا اثر بارہ سال تک برقرار رہا۔

دعا گو

عظیمی

۷ جنوری ۱۹۸۶ئ

1-D-1/7، ناظم آباد۔ کراچی

جناب عظیمی صاحب

السلام علیکم

آپ کے کالمز سے جہاں لوگوں کے مسائل حل ہوتے ہیں وہاں لوگوں کی علمی استعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہمارے اندر تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ جن میں ہمارا کوئی ارادہ واختیار شامل نہیں ہوتا۔ تقاضا ابھرنے کے بعد ہم اپنا ارادہ اختیار استعمال کر کے اس کی تکمیل کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تقاضوں کی ماہیت کیا ہے اور ہم تقاضے کے زیر اثر حرکت کرنے پر کیوں مجبور ہیں۔۔۔۔

ایوب کمال (کینیڈا)

عزیزی برخوردار ایوب کمال

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

زندگی تقاضوں کے دوش پر سفر کر رہی ہے۔ ہمارے اندر تقاضے پیدا ہوتے ہیں اور ہم ان کی تکمیل کرتے ہیں۔ ہمیں بھوک لگتی ہے تو ہم بھوک رفع کرنے کے لئے غذا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پیاس لگتی ہے تو فوراً ہمارا رجحان پانی کی طرف ہو جاتا ہے۔ ہم کھانا کھا لیتے ہیں، پانی پی لیتے ہیں یعنی تقاضوں کی تکمیل کر لیتے ہیں۔ اس طرح ہمیں تسکین مل جاتی ہے اور ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم کسی تقاضے کو نظر انداز کرتے ہیں تو ہمارا ذہن اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور ہمیں بار بار اس کی عدم تکمیل کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم بے چینی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اضطراب و پریشانی ہمارے اندر دور کرنے لگتی ہے۔ ہم کوئی بھی کام ارتکاز توجہ سے نہیں کر سکتے، بار بار ہمارے توجہ بھٹک جاتی ہے۔

تمام تقاضوں کا یہی حال ہے اور کھانا پینا، خوش ہونا، محبت کرنا، معاش کا کام کرنا، اولاد کی تعلیم و تربیت کرنا، ایثار و محبت، دوسروں کے کام آنا الغرض زندگی کی ہر عمل کسی نا کسی تقاضے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ تقاضے دینا کے ہر آدمی میں پیدا ہوتے ہیں اور دنیا کا ہر آدمی کسی نا کسی طرح، کبھی نا کبھی، جلد یا بدیر ان تقاضوں کی تکمیل کر کے اطمینان حاصل کرتا ہے۔ جسم کے تقاضوں کی طرح انسان کی روح میں بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ روح کے تقاضے بھی انسانی شعور کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ ان تقاضوں کی تکمیل ہونی چاہئے۔

روحانی تقاضے اور ان کی تکمیل جسمانی تقاضوں سے زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ان کے نتائج جسمانی تقاضوں کے مقابلے میں زیادہ مسلسل اور عظیم الشان ہوتے ہیں اور ان کی تکمیل کے نتیجے میں انسان کو بہت زیادہ سکون، بہت زیادہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ ہر فکر کو بھول جاتا

ہے۔ سرشاری اور کیف اس کے ذہن کا احاطہ کر لیتا ہے۔ چاروں طرف سے خوشی اور خوشی کے لوازمات اسے حصار میں لے لیتے ہیں اور کسی غم یا کسی پریشانی کو اس کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتے۔ ان روحانی تقاضوں میں سب سے اہم اور سب سے زیادہ بنیادی تقاضا جو ہر انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ انسان کو احساس دلاتا ہے کہ اسے اپنے اللہ سے رابطہ پیدا کرنا چاہئے اور اسے ان خوشیوں اور مسرتوں سے بہرہ مند ہونا چاہئے جو کہ اس رابطہ، اس قربت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ انسان کی روح اس خوشی اور مسرت کے لئے بے قرار ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ انسان اس ذہن کو پس پشت ڈال چکا ہے جو اسے ایسے تقاضوں اور ان کی تکمیل کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے۔ انسان نے چند روزہ مادی زندگی کے عارضی تقاضوں کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ جسم فانی ہے اور جسمانی خوشیاں اور غم بھی عارضی ہیں۔ یہ سب جسم کی موت کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے۔

روح لافانی ہے اس لئے ہر وہ چیز جو روح سے متعلق ہے اپنے اندر لافانیت کا پہلو رکھتی ہے۔

روحانی تقاضوں کی تکمیل کے نتیجے میں جو روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ہمیشہ کی مسرت و آرام کی ضامن ہوتی ہے لیکن المیہ یہ ہے انسان ان سب باتوں کی اہمیت کو فراموش کر چکا ہے، وہ اپنی روح سے دور ہو چکا ہے اور روحانی تقاضوں کی تکمیل کی طرف سے لاپرواہ ہو گیا ہے لیکن اس کی روح اسے اب بھی ان تقاضوں کی تکمیل کی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے۔ انسان اسے خواہ کچھ بھی معانی پہنائے اسے کسی بھی مفہوم میں قبول کرے اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ روح کے بار بار خبردار کرنے پر بھی جب ہم اس کی تکمیل نہیں کرتے تو تقاضے کا ردعمل ظاہر ہوتا ہے یہ وہی ردعمل ہے جو جسمانی تقاضوں کی عدم تکمیل سے بھی پیدا ہوتا ہے۔

اس ردعمل کی کیفیت مذکورہ اولی کیفیت سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ کبھی اس کیفیت کو انسان ذہنی انتشار کی صورت میں محسوس کرتا ہے، کبھی بے اطمینانی اور عدم سکون سے تعبیر کرتا ہے۔ کبھی عدم تحفظ کے احساس کی حیثیت دے دیتا ہے لیکن یہ سب ایک روحانی تقاضے کی عدم تکمیل کے Side Effects ہیں اور تقاضا یہ ہے کہ انسان کی روح چاہتی ہے کہ

۔انسان اللہ سے قربت حاصل کرے اور

۔اس طرح اپنے اصل مقام پر جسے وہ ماضی میں رد کر چکا ہے فائز ہو جائے اور

۔پریشانی اور غم سے محفوظ و مامون ہو جائے

لہٰذا لازم ہے کہ ہم روح کے اس تقاضے کی تکمیل کے لئے عملی اقدام کریں۔

روحانی تقاضوں کی تکمیل کے لئے اولیاء اللہ نے جو اسباق ترتیب دیئے ہیں اس میں مراقبہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

دعا گو

عظیمی

۳۱،مارچ ۱۹۸۶ئ

1-D-1/7، ناظم آباد۔ کراچی

محترم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھیں اور مزید ترقی اور کامیابی سے ہمکنار کریں۔آمین

زندگی تو ہم بھی گزار رہے ہیں مگر ایک آپ کی زندگی ہے کہ محبتوں اور مسرتوں سے لبریز ہے۔میری طرح روئے زمین کا ہر فرد خوش کن زندگی گزارنا چاہتا ہے مگر زندگی کی مادیت ہمیں مایوس کر دیتی ہے۔

آپ ہمیں بتائیں کہ سچی خوشی کیا ہوتی ہے اور حقیقی مسرت کس طرح حاصل کی جاتی ہے تاکہ رہی سہی زندگی ہم بھی سکون سے گزار سکیں۔
براہ کرم میرے سوال کو اہمیت دیتے ہوئے روحانی طرزوں میں جواب شائع فرمائیں۔

شکریہ

نیاز مند

صدیقہ حانم (کراچی)

محترمہ صدیقہ حانم صاحبہ

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

زندگی کے تجزیہ سے ہمارے سامنے ایک ہی بات آتی ہے کہ آدم کا ہر بیٹا اور حوا کی ہر بیٹی خوش کن زندگی گزارنا چاہتے ہیں لیکن زندگی کا مادی نظریہ ہر قدم پر انہیں مایوس کرتا ہے اس لئے کہ ہماری زندگی کا ہر ہر لمحہ فانی اور متغیر ہے۔مادی اعتبار سے ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ سچی خوشی کیا ہوتی ہے اور کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔

حقیقی مسرت سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی اصل بنیاد کو تلاش کریں۔جب ہم کچھ نہیں تھے تو کچھ نہ کچھ ضرور تھے۔اس لئے کچھ نہ ہونا ہمارے وجود کی نفی کرتا ہے۔ہماری زندگی ماں کے پیٹ سے شروع ہوتی ہے اور یہ مادہ جب ایک خاص پروسیس (Process) سے گزر کر اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو ایک جیتی جاگتی تصویر وجود میں آجاتی ہے۔ماحول سے اس تصویر کو ایسی تربیت ملتی ہے کہ اسے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ سچی خوشی ہے کیا اور کس طرح حاصل ہوتی ہے۔۔۔۔

حقیقی خوشی اور مسرت سے ہم آغوش ہونے کے لئے فرد کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہئے کہ زندگی کا دار و مدار جسم پر نہیں بلکہ اس حقیقت پر ہے کہ جس حقیقت نے خود اپنے لئے جسم کو لباس بنالیا ہے۔ ہم اس حقیقت تک اس طرح رسائی حاصل کر سکتے ہیں کہ جب یہ جان لیں کہ جیتی جاگتی تصویر جسم نہیں، پرت در پرت شعور کا مجموعہ ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جسم کے ختم ہونے پر مادی کثافت اور آلودگی ختم ہو جاتی ہے لیکن شعور فنا نہیں ہوتا بلکہ شعور کسی دوسرے عالم میں منتقل ہو جاتا ہے۔

آسمانی کتابوں میں ایک ہی بات کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی صرف مادی جسم نہیں بلکہ ایک شعور ہے۔ شعور کا گھٹنا اور بڑھنا عمر کا تعین کرتا ہے۔ شعور کے ایک زمانہ کو "بچپن" دوسرے زمانہ کو "جوانی" اور شعور کے تیسرے زمانہ کو "بڑھاپا" کہتے ہیں۔

یہ انسانی جسم جو ہمیں نظر آتا ہے اس کے اجزائے ترکیبی کثافت، گندگی، تعفن اور سڑاند ہیں۔ اس سڑاند کی بنیاد اس نظریہ پر قائم ہے کہ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں مادہ (Matter) ہوں اور میں اس مادی دنیا کی پیدائش ہوں۔ یہ محدود نظریہ ہر آدمی کو کسی ایک مقام میں محدود کر دیتا ہے۔

ہر آدمی ایک محدودیت کے تانے بانے میں خود کو گرفتار کر لیتا ہے اور اس طرح محدود اور پابند نظریہ کے ساتھ زندگی کی مادیت کا خول اپنے اوپر چڑھالیتا ہے۔ نتیجہ میں کنوئیں کے مینڈک کی طرح اس خول کو ہی زندگی کا اثاثہ سمجھتا ہے حالانکہ وہ سب کچھ اس خول میں اسے نہیں ملتا جس کی اسے تلاش ہوتی ہے۔ یہ محدودیت اور مادیت کا خول ہی دراصل آدمی کو مایوس رکھتا ہے۔

خوش کن زندگی گزارنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ

ہماری کائنات اللہ کی آواز ہے۔ اللہ جب اپنا تعارف

کراتا ہے تو کہتا ہے کہ میں مخلوق کا دوست ہوں۔ اللہ

اپنی مخلوق کو کبھی فراموش نہیں کرتا مگر آدمی کفالت کے

لئے دنیاوی وسائل کا محتاج بن گیا ہے۔

اگر بندہ رب کو اپنا دوست اور کفیل سمجھ لے تو دنیاوی

وسائل خود بخود اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور

نتیجہ میں بندہ پر مسرت زندگی سے آشنا ہو جاتا ہے۔

خوشی کیا ہے، مسرت و شادمانی ہے۔ ناخوش ہونے سے جو شے تخلیق ہوتی ہے وہ سب پریشانی ہے۔ پریشانی کیا ہے، اضمحلال و پریشانی، مایوسی، نقصان اور انا پر ضرب لگنا ہے۔

آدمی خوش ہوتا ہے تو ٹائم اور اسپیس دونوں نظر انداز

ہو جاتے ہیں اور دھوپ میں سکون کی چادر چھتری بن

جاتی ہے۔

جبکہ ناخوشی (illusion) الوژن ہے۔۔۔۔۔

الوژن (illusion) سے مراد یہ ہے کہ جو شے مستقل تغیر پذیر ہو یعنی اس میں ٹھہراؤ نہ ہو۔ ردوبدل اتنا ہو جاتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ ہم ناخوشی کے اجزائے ترکیبی سے واقفیت حاصل کریں۔ خوشی کیا ہے، خوشی کی مختصر تعریف اطمینان قلب ہے یعنی واحد ذات اللہ پر یقین کے ساتھ اعتماد قائم ہونا۔

دعا گو

عظیمی

۲۲ اپریل ۹۸۶ کراچی

1-D-1/7، ناظم آباد۔ اچی

عزیزالقدر نعیم احمد (گلاسگو۔یوکے)

وعلیکم السلام

جب تصور شیخ کا مراقبہ کیا جاتا ہے تو شیخ کے اندر کام کرنے والی لہریں دماغ میں منتقل ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور جیسے جیسے تصور میں انہماک بڑھتا ہے اسی مناسبت سے لہروں کی منتقلی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

بہت زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ جب ہم مرشد کریم کا تصور کرتے ہیں ہماری نیت یہ ہوتی کہ ہمیں مرشد کریم کا وہ علم حاصل ہو جائے جس علم سے اللہ کا عرفان نصیب ہوتا ہے۔ عمل کا دارومدار نیت پر ہے جب ہم اس نیت کے ساتھ تصور کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ کا وہ علم حاصل ہو جائے جو مرشد کریم کو حاصل ہے تو نتیجہ میں مرشد یا شیخ کے اندر کام کرنے والی وہ لہریں جن سے اس نے اللہ کا عرفان حاصل کیا ہے ہمارے اندر منتقل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ابتداء میں لہروں کی منتقلی سے ہمارے دماغ کی صفائی ہوتی ہے۔ صفائی ہونے کے بعد مرید بے یقینی اور شک سے آزاد ہو جاتا ہے اور ذہن آئینہ کی طرح شفاف ہو جاتا ہے۔ مسلسل ریاضت اور مراقبہ جات اسے اللہ کا ارشاد

تم ہماری بصارت سے دیکھتے ہو، ہماری سماعت سے سنتے ہو اور ہمارے فواد سے سوچتے ہو۔

مشاہدہ میں آجاتا ہے۔ مراقبہ کرنے سے پہلے چار باتوں پر عمل ہونا ضروری ہے۔

۱۔ ذہن منتشر خیالات سے آزاد ہو۔

۲۔ نشست ایسی ہو جس میں جسم اور اعصاب کے اوپر وزن محسوس نہ ہو یعنی جسم اکڑا ہوا یا سخت نہ ہو۔

۳۔ ماحول خوشگوار ہو، اندھیرا ہو، شور وغل نہ ہو اور ماحول میں گھٹن نہ ہو، من پسند خوشبو سے فضا لطیف ہو جاتی ہے۔

۴۔ بہت آہستہ آہستہ اور گہرے سانس لینے کے بعد سینہ میں روکے بغیر منہ سے آہستہ آہستہ خارج کریں۔ سانس نکالتے وقت منہ سیٹی کی طرح گول کریں۔ گہرائی میں سانس لینے سے ذہن بڑی حد تک یکسو ہو جاتا ہے۔

تصور شیخ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے یہ دیکھا جائے کہ شیخ ہمارے سامنے بیٹھا ہے اور شیخ کی شکل وصورت ایسی ہے، ناک ایسی ہے یا آنکھیں ایسی ہیں۔ تصور سے مراد یہ ہے کہ ذہن کو شیخ یا گرو کی طرف متوجہ کر دیا جائے اگر ذہن میں یہ بات ہے کہ شیخ یا گرو کی صورت ایسی ہے، ناک ایسی ہے، آنکھیں ایسی ہیں تو ذہن چونکہ دیکھنے میں مصروف ہو گیا ہے اس لیے یکسو نہیں ہو گا۔

تصور شیخ کا مفہوم ہے۔۔۔۔۔ شیخ کے خیال میں بے خیال ہو جانا۔

دعا گو

عظیمی

۱۶، جولائی ۱۹۸۶ئ

1-D-1/7، ناظم آباد۔ کراچی

برخوردار ماجد

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

دنیا جس دور سے گزر رہی ہے وہ سائنس کا دور ہے، یہاں ہر بات کو حجت اور دلیل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اگر دلائل کے بغیر کوئی بات کہی جائے تو اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ خط کے جواب میں کوشش کی ہے کہ جو بات بھی تحریر کی جائے موجودہ دور کی طرز کے مطابق دلائل اور حقائق پر مبنی ہو۔

زمین وآسمان کے فاصلے ناپنے، چاند سورج کی گردش معلوم کرنے اور چاند کو مسخر کرنے کے خواب دیکھنے والی قوم ایک عرصہ سے اس کوشش میں ہے کہ زمین کے اوپر اور زیر زمین پھیلے ہوئے وسائل کو زیادہ سے زیادہ استعمال کے قابل بنا دیا جائے بڑے بڑے جہاز، آواز سے تیز رفتار طیارے، دیو ہیکل مشین، ریڈیو، ٹیلیویژن، اٹیم اور ہائیڈروجن بم، خلائی سیارے اور اسپیس شپ وغیرہ یہ سب انہیں کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

جہاں تک وسائل اور ان کی صلاحیت کے علم کا انکشاف ہوا ہے، وسائل کے پھیلاؤ اور وسائل اور ان کی صلاحیت کے علم کا انکشاف ہوا ہے، وسائل کے پھیلاؤ اور وسائل کی زندگی یا حرکت میں کس حقیقی فارمولے کا عمل دخل ہے اور اس فارمولے کے پیچھے کون سی طاقت کام کر رہی ہے اور اس طاقت سے کام لینے والی ہستی کون ہے، سائنس خاموش ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مادی دور کی اس ترقی میں براہ راست قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کا دخل ہے۔ مثلاً لوہا ہماری ہر ترقی میں داخل ہے۔ آپ کس جگہ نہ پائیں گے، ریل کی پٹری میں، جہازوں کی تہہ میں، مشینوں کے کل پرزوں میں، وائرلیس اور خلائی سیاروں میں، اونچی اونچی بلڈنگوں، سائنس کی بے شمار مصنوعات میں، مسجدوں، مندروں اور گرجاؤں میں، کون سی ایسی جگہ ہے جہاں (کسی نہ کسی صورت میں ہی سہی) اس کے وجود سے انکار کیا جا سکتا ہو۔۔۔۔۔

قرآن کریم کی زبان میں بتایا گیا ہے

اور ہم نے پیدا کیا لوہے کو بے شمار صلاحیتوں کے ساتھ اور تحقیق اس میں انسانی دنیا کی ترقی کے لئے بڑے امکانات ہیں۔

ہماری ذہنی کاوش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ ہم لوہے یا لوہے کی قسم کی دوسری دھاتوں اور ارض پر موجود وسائل سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ذہن کو جس طرح حرکت دی جاتی رہی ہمارے سامنے فوائد یا نقصان آتے رہے اور ہم نئی سے نئی اختراع کرنے پر قادر ہو گئے مگر انسان نے اس تلاش میں ہمیشہ کوتاہی کی، جس ہستی نے وسائل میں اتنی زبردست صلاحیتیں ذخیرہ کی ہیں وہ کون ہے اور ان وسائل کی پیدائش سے اس ہستی کا منشاء اور مقصد کیا ہے۔۔۔۔

ہم نے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کہ ان چیزوں کے کارآمد بنانے کی صلاحیتیں ہمارے ذہن میں کس طرح اور کہاں سے آتی ہیں۔۔۔ذہن اور وسائل کی صلاحیتوں کا باہمی اشتراک کن خطوط پر قائم ہے۔۔۔ایک طرف خود لوہے کی صلاحیت ہے اور دوسری طرف انسان کے ذہن میں اس صلاحیت سے حسب منشاء فائدہ اٹھانے کی صلاحیت موجود ہے۔

قرآن کریم کا یہ ارشاد کتنا واضح ہے کہ ہم نے لوہے کو بے شمار صلاحیتوں کے ساتھ اس لئے پیدا کیا کہ انسان اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔اللہ انسان کی صلاحیت کا تذکرہ فرما کر یہ بتا رہے ہیں یہ انسان قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں اور قوتوں کو کام میں لانا چاہے تو وہ ہر چیز پر قادر ہو سکتا ہے۔آیت مقدسہ میں تفکر کے بعد یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ موجودات میں ہر شے اپنے اندر دو وصف رکھتی ہے۔

ایک وصف ظاہری اور دوسرا باطنی مثلاً پانی ظاہری طور پر رقیق اور سیال مادہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کی باطنی قوت باوصف اسٹیم ہے جو بڑی سے بڑی مشین کو معمولی جھٹکے کے ساتھ حرکت میں لے آتی ہے۔کسی بھی درخت کا کوئی بیج باطنی طور پر اپنے اندر بہت بڑا درخت رکھے ہوئے ہے۔کوئی بھی پھل اور اس کے اندر خوشبو اور ذائقہ۔کائنات میں کوئی وجود اس وصف سے خالی نہیں اور ہر موجود شے دو اوصاف سے مرکب ہے۔کوئی بھی شخص جب اپنی ذہنی فکر اور کوششوں سے کسی نئی چیز کو عالم وجود میں لے آتا ہے تو اس کی پہلی اور آخری خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ چیز اس کے تعارف کا سبب بن جائے۔یہ وصف انسان کو اللہ سے ملا ہے۔اللہ فرماتے ہیں کہ

میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کو تخلیق کیا، اس لئے کہ میں پہچانا جاؤں۔حدیث قدسی

اللہ کے اس فرمان کے تحت ہر چیز کو وجود میں لانے والی ہستی کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ کائنات میں جس قدر مصنوعات ہیں وہ اس کے تعارف کا ذریعہ قرار پائیں۔رسالت کا اقرار اور تعلیم ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ انسان اگر اپنے باطنی وصف کے علم کو حاصل کرلے تو وہ موجودات کو وجود میں لانے والی ہستی کو پہچان سکتا ہے۔جب تک انسان اس مقصد کو پورا نہ کردے بے شک وہ خسارے اور نقصان میں ہے۔

دعا گو

عظیمی

۱۷،اکتوبر ۱۹۸۶ء

D-1/71-، ناظم آباد۔کراچی

عزیزی عرفان بساطیہ عظیمی

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

دنیا میں یہ جو چوبیس گھنٹے گانا بجانا، غضب، حق تلفی، قتل وغارت گری، تعصب، بددیانتی، اقربانوازی، خویش پروری، حرص ولالچ، دھوکہ اور فریب دہی کے اعمال ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب اعمال کہاں جاتے ہیں۔۔۔۔۔بلاشبہ دعامیں اگر صدق نہ ہو، گداز نہ ہو، ایسا گداز جو وجدان کو حرکت میں لے آئے تو ایسی دعا کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو آپ کے غیر حقیقی اعمال کا ہوتا ہے۔اس قسم کی جتنی دعائیں مانگی جاتی ہیں وہ سب بے کار اور ندنصیبی پر محمول کی جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان بدنصیبی اور پھٹکار کے شکنجے میں اس طرح جکڑ گیا ہے کہ اب مسلمان کو قرون اولی مسلمان کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔۔یہ صحیح ہے کہ مسلمان بڑی ہی مصیبت اور بدحالی کا شکار ہے۔اس کی کیا وجہ ہے۔۔۔۔۔ایک طرف واعظ اور اس کی مصلحتوں کا پھندا پڑا ہوا ہے اور دوسری طرف سرمایہ دار حضرات نے اپنی اجارہ داری قائم کی ہوئی ہے۔

ہم اللہ سے دعا مانگتے ہیں تو ہمارا ذہن روٹی، کپڑے سے باہر قدم ہی نہیں رکھتا۔ہمیں مصیبتوں، پریشانیوں اور بیماریوں ہی سے کب فرصت ملتی ہے کہ ہم ذہنی سکون کے ساتھ دعا کرنے کے قابل ہوں۔

اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ قوم نام ہے افراد کا۔افراد جب اپنے نبی ﷺ کے مشن سے دور ہو جاتے ہیں تو ان کے اندر احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے اور احساس کمتری صلاحیتوں کو نیست ونابود کر دیتا ہے۔شیطانی گروہ اللہ کی مخلوق کی اس کمزوری سے واقفیت کی بناء پر ہمیشہ اس بات کو کوشش کرتا ہے کہ جس طرح بھی ہو ان کو اس احساس سے نہ نکلنے دیا جائے۔

اللہ کا ارشاد ہے کہ

اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے راستے پر خرچ نہیں کرڈالتے پس ان کے لئے عذاب الیم کی بشارت ہے۔

صاحب اختیار لوگ اپنے مخصوص رہن سہن اور اپنے بنائے ہوئے قواعد وضوابط کے ذریعہ اللہ کی مخلوق کو اتنا ہراساں کر دیتے ہیں کہ ان کا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے اور دماغ تعطل کا شکار، یکسوئی اور آزاد ذہن کی نشوونما نہیں ہوتی اور یہ احساس کمتری کا وہ درجہ ہے جہاں پوری قوم انسانیت کے دائرے سے نکل کر بھیڑ اور بکریوں کو صف میں شامل ہو جاتی ہے۔اس آیت کو پڑھئے اور غور کیجئے

جب تک کوئی قوم خود اپنے اندر تغیر نہیں چاہتی، اللہ اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں فرماتے۔

جب قوم اپنے اندر تبدیلی چاہتی ہے تو گروہ ملائکہ اس قانون کے تحت اس امر پر کاربند رہتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیں۔فرشتے ان کی مرضی اور منشاء کے مطابق ان کے دائیں بائیں، آگے پیچھے رہ کر شیطانی طاقتوں سے ٹکرا جاتے ہیں اور جو حشر شیطانی طاقتوں کا ہوتا ہے، اس سے آپ کی زمین کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

دعاؤں کے ساتھ عمل نہ ہو، کردار نہ ہو، اخلاق نہ ہو تو یہ دعائیں بھی زمین کے کناروں سے باہر نہیں نکلتیں۔ اللہ کے قانون کے مطابق وہ دعائیں مقبول بارگاہ ہوتی ہیں جن کے ساتھ مسلسل اور پیہم عمل ہو۔ سیدنا حضور ﷺ کی مقدس اور مطہر زندگی ہمارے سامنے ہے۔ حاصل کائنات، اللہ کے پیارے نبی ﷺ نے محض زبانی جمع خرچ کا درس نہیں دیا، مسلسل حرکت اور جدوجہد سے تعبیر زندگی کا اعلیٰ وارفع نمونہ پیش کیا ہے۔

ہم زبانی دعویٰ تو بہت کرتے ہیں مگر عمل کے میدان میں ہماری حیثیت برگ و بار کی نہیں، کانٹوں کی ہے۔ کون نہیں جانتا جھوٹ، اقربانوازی، ذخیرہ اندوزی، غیبت، آپس میں پھوٹ ڈالنا، دوسروں کو کمتر جاننا، زندگی کے بلند معیار کے فسوں میں خود کو گرفتار کر لینا کربناک عذاب ہے۔ ہم دوزخ کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ہاتف غیبی آوازیں دے رہا ہے کہ جدھر تمھارا رخ ہے وہ ہلاکت کی راہ ہے مگر افسوس سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود ہم نے اپنی زندگی کو عقوبت خانہ بنالیا ہے۔

دعاگو

عظیمی

دسمبر ۱۹۸۶

1-D-1/7، ناظم آباد۔ کراچی

محترم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

روحانی سلاسل میں تصور شیخ کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تصور شیخ کیا ہے، کیسے کرتے ہیں اور اس کے کیا فوائد ہیں۔۔۔۔

میں نے پڑھا ہے کہ تصور شیخ سے علوم منتقل ہوتے ہیں اور ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ توجہ بیان فرمادیں تو نوازش ہو گی۔

شکریہ

تصدق حسین

عزیزی تصدق حسین صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

آپ نے تصور شیخ کے بارے میں پوچھا ہے۔ تصور کی صحیح تعریف سمجھنے کے لئے دو بنیادی باتوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ کسی چیز کی معنویت اور حقیقت ہمارے اوپر اس وقت آشکار ہوتی ہے جب ہم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کوئی چیز ہمارے سامنے ہے لیکن ذہنی طور پر ہم اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں تو وہ چیز ہمارے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مثلاً ہم گھر سے نکلتے ہیں کہ ہمیں دفتر جا کر اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں، اگر دفتر پہنچنے کے بعد کوئی پوچھے کہ آپ نے راستہ میں کیا کیا چیزیں دیکھیں تو ہم کہیں گے کہ ہم نے دھیان نہیں دیا حالانکہ یہ ساری چیزیں نظروں کے سامنے سے گزری ہیں۔

دوسری اہم بات دلچسپی اور ذوق و شوق ہے۔ ہم کوئی دلچسپ کتاب پڑھتے ہیں تو وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس کوئی غیر دلچسپ مضمون پڑھ کر چند منٹ میں ذہن بوجھ اور کوفت محسوس کرنے لگتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ذہنی مرکزیت کے ساتھ ساتھ اگر دلچسپی اور ذوق و شوق ہو تو کام آسان ہو جاتا ہے۔

مراقبہ یا تصور کی مشقوں سے بھرپور فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ صاحب مشق جب بھی آنکھیں بند کر کے تصور کرے تو اسے خود سے اور ماحول سے بے نیاز ہو جانا چاہئے۔ اتنا بے نیاز کہ اس کے اوپر سے بتدریج ٹائم اور اسپیس کی گرفت ٹوٹ جائے یعنی اس تصور میں اتنا انہماک ہو جائے کہ وقت گذرنے کا احساس نہ رہے اور ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہم کسی ایک تصور یا خیال میں بے خیال ہو جاتے ہیں۔ بے خیال ہو جانے کا مطلب ہے ہم صرف ایک خیال میں یکسو ہو جاتے ہیں اور ہمیں کوئی دوسرا خیال نہیں آتا۔

یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ اگر آپ نور کا تصور کر رہے ہیں تو آنکھیں بند کر کے کسی خاص روشنی کو دیکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ صرف نور کی طرف دھیان قائم کریں۔ نور جو کچھ ہے اور جس طرح ہے از خود آپ کے سامنے آجائے گا۔ اصل مدعا کسی ایک طرف دھیان کر کے ذہنی یکسوئی حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد باطنی علم خود بخود کڑی در کڑی ذہن پر منکشف ہونے لگتا ہے۔

تصور کا مطلب اس بات سے کافی حد تک پورا ہو جاتا ہے کہ "کسی ایک خیال میں بے خیال ہونا"۔

اگر ہم کھلی یا بند آنکھوں سے کسی چیز کا تصور کرتے ہیں اور تصور میں خیالی تصویر بنا کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ عمل ذہنی یکسوئی کے دائرہ میں نہیں آتا۔ ذہنی یکسوئی سے مراد یہ ہے کہ آدمی شعوری طور پر دیکھنے اور سننے کے عمل سے بے خبر ہو جائے۔

دعا گو

عظیمی

۲۲، جون ۱۹۸۷ء

1-D-1/7، ناظم آباد۔ کراچی

عظیمی صاحب کو ۱۹۸۹ میں ناگپور کی زیارت کے دوران سلسلہ عظیمیہ کے نہایت مخلص اور ہمدرد دوست اکبر صاحب اور نور صاحب نے پاکستان سے خط لکھا۔ خط کے مندرجات ریکارڈ میں موجود نہیں البتہ عظیمی صاحب کی جانب سے لکھی گئی جوابا تحریر قارئین کے لئے شائع کی جارہی ہے تاکہ اولیاءاللہ سے عقیدت رکھنے والے افراد ایک فقیر کی تاج العارفین اور سراج السالکین کے دربار میں حاضری کا مختصر احوال پڑھ سکیں۔

روحانی فرزندان جناب اکبر صاحب اور نور بھائی

السلام علیکم ورحمۃاللہ

یہ خط میں آپ کو تاج آباد شریف، ناگپور سے لکھ رہا ہوں۔ صورتحال کچھ یوں ہے تاج آباد شریف سے کامٹی جہاں امّاں رحمۃاللہ کا مزار ہے، بائیس کلو میٹر ہے۔ ایک بڑی نہر میں سے گزر کر مزار تک پہنچنا پڑتا ہے، نہر پر کوئی پل نہیں ہے۔ حضور نانا تاج الدین رحمۃاللہ علیہ کا جنگل بیابان میں شفاخانہ، ہائیکورٹ اور مدرسہ ہے۔ جہاں نانا کے پاس شیر آتا تھا وہ مقام تاج آباد سے ۳۴ کلو میٹر پر ہے۔ شکر درہ جہاں پاگل خانہ ہے، اس کا فاصلہ ۱۴ کلو میٹر ہے۔ ناگپور ریلوے اسٹیشن تاج آباد سے آٹھ کلو میٹر دور ہے۔

یہاں آنے والے زائرین بصد شوق ان مقامات کی زیارت کرتے ہیں۔ ہر جگہ اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ تاج آباد میں حضور نانا تاج الدین رحمۃاللہ علیہ کو جتنے دیکھنے والے بزرگ تھے ان کے مزارات ہیں۔ بعض مزارات بہت خوبصورت ہیں۔ تاج آباد میں کوئی پختہ عمارت نہیں ہے ماسوائے مسجد اور مزار کے۔ سارے گھر جھونپڑوں میں آباد ہیں۔

پہلے ۲۴ گھنٹے آدمی گم سم رہتا ہے، اس کے بعد دل لگنا شروع ہو جاتا ہے اور پھر یکسوئی کی کیفیت ہو جاتی ہے۔

حضور نانا تاج الدین رحمۃاللہ علیہ کی قدم بوسی نصیب ہوئی۔ آپ سب عظیمی برادران، ہمشیرہ اور عظیمی دختران و پسران کے لئے دعا کی گئی۔ حضور نانا تاج الدین رحمۃاللہ علیہ سلسلہ عظیمیہ کی ترقی سے بہت خوش ہیں اور مزید ترقی کے لئے دعا گو ہیں۔

مریم اماں کے سجادہ نشین نے بتایا کہ حضور نانا تاج الدین رحمۃاللہ علیہ نے فرمایا ہے،

کائنات میں سب سے بڑی چیز محبت ہے اور سب سے

چھوٹی چیز آنسو ہے۔ محبت پر کائنات قائم ہے اور آنسو

سے اللہ کی رحمت جوش میں آجاتی ہے اور بندہ کے اوپر

محیط ہو جاتی ہے۔

انشاءاللہ ۲۷،مارچ کو صبح بمبئی سے کراچی روانہ ہو جاؤں گا۔ میری طرف سے سب دوستوں کو سلام، بچوں کو پیار۔

دعا گو عظیمی

۱۷،مارچ ۱۹۸۹

ناگپور۔ بھارت

محترم عظیمی صاحب

اللہ آپ سے خوش ہوں اور رسول اللہ کی شفاعت آپ پر سایہ فگن ہو۔

آمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

جاننا چاہتا ہوں کہ ہمارے جسم پر عمومی اور دل و دماغ پر خصوصی طور پر نمک کے استعمال سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ روحانی اور طبّی نقطہ نظر سے نمک اور مٹھاس کی کیا افادیت ہے اور ان کا کس حد تک استعمال ہونا چاہئے۔ کہ نمک کے زیادہ استعمال سے دماغی امراض کیوں پیدا ہوتے ہیں اور مٹھاس کی زیادتی سے یہ امراض کس طرح کنٹرول ہوتے ہیں یا آدمی ان امراض سے کس طرح محفوظ رہتا ہے۔

شکریہ

ڈاکٹر محمد طارق (کوئٹہ)

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

اگرچہ یہ بات بے محل ہے لیکن اس پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ ممکن ہے کسی نے اس پر روشنی نہ ڈالی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی تشریح کی گئی ہو لیکن ہماری نظر سے نہ گزری ہو۔ جس مقام پر آنے والہ روحیں رہتی ہیں اس مقام کو "برزخ" کہتے ہیں۔

روح کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے

اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ النور: ۳۵

روح کو Sprit کہا جاتا ہے۔عالم برزخ میں جو کچھ موجود ہے اور جو چیز عالم ناسوت (دنیا) میں منتقل ہوتی ہے اس کا تعلق ایک طرف نور سے ہے اور دوسری طرف روح سے ہے۔جب عالم برزخ سے عالم ناسوت میں روح منتقل ہوتی ہے تو عالم ناسوت میں داخل ہونے کے لئے اس کو کرو موسوم (دخان) ملتا ہے۔کرو موسوم بہت مختصر جسامت رکھتا ہے جب کہ روح کا قد و قامت ایک ہے۔قد و قامت سے مراد ہے کہ روح میں بچپن اور بڑھاپا نہیں ہوتا۔روح جب کرو موسوم میں داخل ہوتی ہے تو کرو موسوم کی جسامت بڑھنا شروع ہو جاتی ہے، حد یہ ہے کہ آدمی جوان ہو جاتا ہے۔کرو موسوم دراصل جسم ہے۔سر، ہاتھ، پیر، سینہ، دل، دماغ، پھیپڑے وغیرہ۔

خاص طور پر دماغ کا تذکرہ مقصود ہے۔کرو موسوم کے دماغ میں دو کھرب خلیے ہوتے ہیں جو وقتاً فوقتاً ضرورت کے مطابق کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔یہ وہی دماغ ہے جس کو ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں۔حوادث زندگی، تجربات اور موت و زیست اسی دماغ کے ساتھ پیش آتے ہیں۔کردار میں پختگی، شرافت، قلب میں تسکین یا زندگی سے بیزاری، خود پسندی، کبر و غرور، غضب اور رحمت سب اسی دماغ سے متعلق ہیں۔

اللہ نے سورۂ یٰسین کی آخری آیتوں میں فرمایا ہے

اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو کہتا ہے ہو اور وہ ہو جاتی ہے۔یٰسین: ۸۲

کسی چیز کے وجود میں آنے کے لئے اللہ "امر" کرتا ہے۔امر کے کئی اجزا ہیں۔اصل جزو ارادہ ہے، دوسرا "کن" ہے جو اللہ کے ذہن میں آتا ہے اور وہ چیز فوراً ہو جاتی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے ایک قانون بنا دیا ہے اور ہمارا ہر عمل اس قانون کے تحت واقع ہوتا ہے۔ہم اس قانون کے اندر قدم اٹھا سکتے ہیں، اس قانون کی حد سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔یہ وہی قانون ہے جس کے تحت دماغ میں دو کھرب خلئے کام کرتے ہیں۔دماغ میں خیال سے صرف وہ خلئے کھلتے ہیں جن خلیوں کا تعلق اس خیال سے ہے۔آپ یہ نہ سمجھیں کہ خیال کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے۔وہ اتنا ٹھوس ہوتا ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

کسی چیز کو مظہر بننے کے لئے تین مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔وہ تین مراحل

وہم

خیال۔۔۔اور

احساس ہیں۔

ہمارے دماغ پر جب وہم وارد ہوتا ہے تو وہم کے خلیے کھل جاتے ہیں وراس وہم کے خلیوں کو جو اس چیز سے متعلق ہیں جس کو مظہر بننا ہے۔اگر وہم ذرا ٹھہر جائے تو وہ خیال بن جاتا ہے اور احساس کے خلئے کھل جاتے ہیں۔احساس نکل گیا تو بات ختم ہو گئی اور اگر ٹھہر گیا تو فوراً یہ احساس "حواس" میں تقسیم ہو جاتا ہے۔اب آدمی دیکھنا، سننا، چھکنا شروع کر دیتا ہے۔

یہ صرف دماغ کے خلیوں کا کرشمہ ہے، بشرطیکہ وہ کھل گئے ہوں۔اگر کسی شخص کے حواس میں اختلال ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خلئے جو حواس "حس" سے متعلق ہیں، پوری طرح نہیں کھلے یا بالکل نہیں کھلے جس کی وجہ سے وہ اس حس سے محروم ہو گئے۔اس میں سوچنے کی حس بھی شامل ہے۔

بہت زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ تمام اعصاب انہی خلیوں کے کھلنے یا بند ہوتے رہنے سے متاثر ہوتے ہیں۔جتنی بیماریاں ہیں انہی خلیوں کے غلط کھلنے یا غلط بند ہونے سے وجود میں آتی ہیں۔ذہن میں سوال آسکتا ہے کہ غلط کھلنا اور غلط بند ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔۔۔سمجھئے۔۔۔ذرا غور سے سمجھئے۔

دو وہم ایک ساتھ آئے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد تھے۔خلیوں کا کام یہ ہے کہ وہ ایک وہم کے ساتھ پوری طرح کھلیں لیکن جب دماغ میں ایک ساتھ دو وہم آئیں تو وہ پوری طرح نہ کھل سکتے ہیں اور نہ بند ہو سکتے ہیں۔یہی حال خیال اور احساس کا ہے۔یہ تفصیلات صرف روح سے متعلق ہیں، کرموسوم یعنی جسم سے متعلق نہیں۔

اب آپ کرموسوم کا حال سنئے جس وقت دو وہم یا دو خیال ایک ساتھ آتے ہیں دو خلیے یا جتنے خلیے کھلیں گے یا بند ہوں گے، ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے۔یہ وہی خلئے ہیں جو کرموسوم بنتے ہیں اور ان کے اندر روح کام کر رہی ہے۔جب ٹکراؤ ہو گا تو لازماً ان کے اندر بے ترتیبی اور بدحواسی واقع ہو گی جو اعصاب میں من و عن اسی طرح آئے گی او کسی نہ کسی بیماری کی شکل اختیار کرے گی۔

کرموسوم کے اجزائے ترکیبی میں جزو اعظم۔۔۔نمک ہے، اس کے بعد دوسرا جز مٹھاس ہے۔باقی تمام اجزا ان دو اجزا کے مقابلہ میں ثانویت رکھتے ہیں۔۔۔لیکن۔۔۔جزو اعظم نمک کی معین مقدار خلیوں کو صحت مند رکھتی ہے۔اس مقدار میں اگر زیادتی ہو جائے تب بھی اور کمی ہو جائے تو اس صورت میں بھی خلیوں کا متاثر ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔لو بلڈ پریشر اور ہائی بلڈ پریشر کی مثال آپ کے سامنے ہے۔

نمک کی تخلیق میں مصروف دو اجزاء کو بہت زیادہ دخل ہے

سوڈیم کلورائید

پوٹاشیم کلورائیڈ

سوڈیم کلورائید نمک کا جزو اعظم ہے۔ سوڈیم کلورائید خلیوں کے اوپر سب سے زیادہ اثرانداز ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ دماغی خلئے سوڈیم کلورائید سے بھر گئے ہیں تو ہم نمک کے ترک کا مشورہ دیتے ہیں۔ نمک میں سوڈیم کلورائیڈ چار حصے اور پوٹاشیم کلورائید ایک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ایک حصہ نقصان دہ نہیں ہوتا اور چار حصے بعض حالات میں نہایت مضر ہوتے ہیں

دعا گو عظیمی

مارچ ۱۹۸۹

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

عزیز دوست

ارشاد علی خان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نیاز احمد عظیمی صاحب کے بدست آپ کا خط ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔ اللہ آپ کو دین اور دنیا کی ساری خوشیاں دیں۔ آمین

جنسی جذبات قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہیں۔ اس کی ہمیشہ قدر کرنی چاہئے۔ مادی طور پر اس جذبہ سے انسان کی نسل میں اضافہ ہوتا ہے اور روحانی طور پر عالم بالا اور آسمانوں میں پرواز ہوتی ہے۔

جب بھی فریق ثانی کو دیکھ کر جذبات میں ہیجان ہو، اللہ کی قدرت، صناعی اور کل رنگ دنیا کی خوبصورتی کو ذہن میں بار بار دہرائیں۔ اس عمل سے آپ کے اندر اللہ کی مصنوعات میں غور و فکر کا پیٹرن مستحکم ہو جائے گا اور پھر آپ اس کے قریب ہو جائیں گے۔

انسان کے اندر بنیادی کمزوریاں تین ہیں۔

۱۔ غصہ

۲۔ جنس

۳۔ اقتدار کی خواہش

غصہ سے انسان کے اندر وہ روشنیاں جن کے اوپر زندگی قائم ہے۔ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔

جنس کے بارے میں پہلے لکھا جا چکا ہے۔

اقتدار کی خواہش انسان کے اندر کبر و نخوت پیدا کرتی ہے جو شیطان کی صفت ہے۔ اللہ نے غصہ کرنے کو بڑا سختی سے منع کیا ہے۔

قرآن میں ہے

جو لوگ غصہ نہیں کرتے۔ اللہ ایسے احسان کرنے والے بندے سے محبت کرتے ہیں۔

اپنے سب دوستوں کو، والد صاحب کو اور والدہ کو میرا اسلام عرض کریں۔۔۔

عرس کے مبارک موقع پر تشریف لائیں۔ مجھے بہت خوشی ہو گی۔

دعا گو عظیمی

۱۹، نومبر ۱۹۸۹

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

محترم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمۃاللہ

امید ہے آپ خیریت سے ہیں۔امراض کی روحانی تشریح اور توجیہہ چاہتا ہوں۔ازراہ کرم راہنمائی فرمایئے۔

ڈاکٹر جاوید سمیع ،شوگر اسپیشلسٹ (کراچی)

وعلیکم السلام ورحمۃاللہ

سر پر بہت سے بال ہوتے ہیں، یہ سب کے سب مل کے انٹینا کا کام کرتے ہیں۔اگر بال نہ بھی ہوں تو بھی مسامات انٹینا کیجگہ کام کرتے ہیں۔کوسمک رہز گشت کرتی رہتی ہیں۔۔۔ان ہی شعاعوں پر زندگی کا انحصار ہے۔یہ شعاعیں مجموعی طور سے دماغ میں داخل ہوتی ہیں اور تقریباً تین چوتھائی مقدار دماغ اور ایک چوتھائی جو باقی دماغ میں داخل ہوتی ہیں اور تقریباً تین تین چوتھائی مقدار دماغ اور ایک چوتھائی جو باقی رہیں وہ پورے جسم پر فعال کردار ادا کرتی ہیں۔اگر توازن میں کسیطرح کی کمی واقع ہو جائے مثلاً دماغ پر نوے فیصد خرچ ہونے لگے اور جسم کے لئے صرف دس فیصد باقی رہے تو اعصابی نظام میں کمزوری آجائے گی اور آہستہ آہستہ غلبہ حاصل کرلے گی۔۔دماغ پر نوے فیصد کوسمک ریز خرچ ہو تو اس عمل سے حسیات کی صلاحیتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔مثلاً لکھنے کی، سننے کی، سوچنے کی قوتیں کئی گنا ہو جاتی ہیں۔اس فارمولے کے نتیجے میں غیب، شہود بن سکتا ہے۔یا بن جاتا ہے۔

جسم کے لئے جو دس فیصد باقی رہا ان سے اندرونی طور پر اعصابی کمزوری رونما ہو جائے گی اور بیرونی طور پر اعصاب اکڑ کر سخت ہو جائیں گے۔یہی وجہ ہے کہ ایک پاگل آدمی پر کئی آدمی مل کر بھی قابو نہیں پا سکتے۔

غور کیجئے کہ اگر کوسمک رہز تین چوتھائی سے بہت کم دماغ پر خرچ ہوتی ہے اور بہت زیادہ جسم کے لئے بچتی ہیں تو اس سے اعصابی نظام اندرونی طور پر بہت طاقتور ہو جاتا ہے لیکن بیرونی طور پر بالکل کمزور اور بیمار معلوم ہوتا ہے اور دماغ بہت کم کام کرتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ آدمی پاگل پن کی طرف بڑھتا ہے یا بالکل پاگل ہو جاتا ہے۔یہ دونوں صورتیں آدمی کو پاگل کر دیتی ہیں لیکن پاگل پن کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔

اس ضمن میں بیماری کے مختلف مدارج رونما ہوتے ہیں۔ یہ تمام اعصابی بیماریاں ہیں۔ آدمی دماغی طور پر مفلوج ہو یا جسمانی طور پر ل، دونوں حالتوں میں مفلوج ہو جاتا ہے۔ یہ ہمیشہ کو سمک ریز کے عدم توازن سے ہوتا ہے۔ یہی وہ کو سمک ریز ہیں جو دماغ سے داخل ہو کر دل میں پہنچتی ہیں اور یہ عمل دل کو حرکت دیتا ہے۔ جب یہ دل کو پمپ کرتی ہیں تو خون کے ذریعے جسم کی باریک ترین رگوں اور ریشوں سے گزرتی ہیں۔ جسم کو سیراب کرنے کے بعد مسامات سے خارج ہو جاتی ہیں۔ فی الحقیقت یہ الیکٹرک فورس ہوتی ہیں۔ خالص پانی (H2O) ناموزوں کنڈیکٹر ہے اور خون بہترین کنڈیکٹر ہے۔ خون کو سمک ریز کے پریشر کو ضائع نہیں کرتا بلکہ جتنا پریشر اس کے ہر ذرہ کو ملتا ہے اتنا ہی پریشر وہ دوسرے ذرات کو پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کو سمک ریز کی فورس یا پریشر کبھی کم نہیں ہوتے۔

ہاں اگر خوب میں کوئی ایسا نقص پیدا ہو جائے جو ذروں کے پریشر اٹھانے کی صلاحیت کم کر دے یا مفقود کر دے تو جسم کے وہ حصے جن سے بیمار خون گزرتا ہے، مفلوج ہو جاتا ہے۔ فالج کی ایک قسم نہیں ہے بلکہ فالج ایک ہزار قسم کی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ اگر خون کی بیماری دل پر اثر انداز ہوں تو دل کی حرکات میں فرق آجاتا ہے۔ دماغ پر اثر انداز ہوں تو سوچنے کی صلاحتیں متاثر ہو جاتی ہیں، بعض اوقات فیصلے کی قوت بالکل نہیں رہتی۔ کبھی کبھی آدمی گونگا، بہرہ، اندھا بھی ہو جاتا ہے۔ بجز اس کے کہ اس کے اندر بھوک پیاس وغیرہ وقت کے اوپر بیدار ہو جائیں۔ یہ صلاحیتیں محض اس لئے متاثر نہیں ہوتی۔ اتنی نہیں ہوتی جو دماغ کو سیراب کر سکے۔ دماغ کی سیرابی کے بغیر ہوش و حواس غیر متوازن رہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ کو سمک ریز کا تین چوتھائی حصہ دماغ پر خرچ ہوتا ہے، ایک چوتھائی حصہ تمام جسم پر۔ آپ نے ایسے پہلوانوں کو دیکھا ہو گا کہ ان کا دماغ اکثر غیر متوازن ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے جسم پر کو سمک کا ایک چوتھائی سے زیادہ حصہ صرف ہونے لگتا ہے۔ جتنا زیادہ صرف ہوتا ہے اسی مناسبت سے ان کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ خون دور کرتا ہے۔ دوران خون ہر آدمی کے جسم میں یکساں نہیں ہوتا۔ یہی بات بیماری کی جڑ ہے۔ اگر دوران خون غیر متوازن ہو جائے یعنی ایک سطح سے نیچے آجائے تو آدمی بیمار ہو جائے گا۔ دوران خون کے لئے اوپر بھی ایک سطح مقرر ہے اگر اس سے زیادہ ہو جائے گا تو بھی آدمی بیمار ہو جاتا ہے۔

السلام علیکم ورحمۃاللہ

درخواست ہے کہ جس قدر ممکن ہواور شعور کے دائرہ کار میں آجائے تحریر فرمائیں کہ عالم اعراف کیا ہے۔

اشفاق حسین (مانچسٹر۔ برطانیہ)

وعلیکم السلام ورحمۃاللہ،

عالم اعراف کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے

خرابی ہے کم تولنے والوں کے لیے جن کا یہ حال ہے کہ جب لوگوں سے ناپ لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن اٹھا کر لائے جانے والے ہیں۔ اس دن جب سب لوگ اللہ کے رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ہر گز نہیں، یقیناً بدکاروں کا نامہ اعمال قید خانہ (سجین) میں ہے اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ قید خانہ کا دفتر سجین کیا ہے۔۔۔ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لئے، ان لوگوں کے لئے جو روز جزا کو جھٹلاتے ہیں اور روز جزا کو وہی لوگ جھٹلاتے ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے بدعمل ہیں۔ انہیں جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تو اگلے وقتوں کی کہانیاں ہیں۔ اپنے گھروں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے اور جب دیکھتے تو کہتے تھے یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں حالانکہ وہ ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ آج ایمان لانے والے کفار پر ہنس رہے ہیں۔ مسندوں پر بیٹھے ہوئے ان کا حال دیکھ رہے ہیں۔ اب بدلہ پایا منکروں نے جیسا کرتے تھے۔ المطففین: ۱-۳۶

قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیات مرنے کے بعد زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ روحانی نگاہ دیکھتی ہے کہ آدمی کے کندھوں پر دو فرشتے موجود ہیں اور کچھ لکھ رہے ہیں لیکن لکھنے کی طرز یہ نہیں ہے جو ہماری دنیا میں رائج ہے۔ نہ ان کے ہاتھوں میں قلم ہے اور نہ سامنے کسی قسم کا کاغذ ہے۔ فرشتوں کا ذہن کوئی بات نوٹ کرتا ہے اور وہ بات فلم کی طرح ایک جھلی پر نقش ہو جاتی ہے۔

ان روحانی حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اس دنیا میں جو عمل کرتا ہے اور عمل کے پس پردہ جو جو سوچ کام کر رہی ہے۔ وہ فلم کی صورت میں ریکارڈ ہو جاتی ہے، جسے قرآن کریم نے کتاب المرقوم کہا ہے۔ مرنے کے بعد انسان یہ فلم (کتاب المرقوم) دیکھتا رہتا ہے۔ برے آدمی کے سامنے اس کے برے ارادوں، برے اعمال اور برے اعمال پر ضمیر کی ملامت ظلم کی صورت میں ڈسپلے ہوتی ہے تو اسے دیکھ کر شدید اذیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ یہ اذیت پچھتاوا بن کر اس پر مسلط رہتی ہے۔ نیک انسان مرنے کے بعد جب اپنے نیک ارادوں، نیک اعمال اور اعمال کے نتیجہ می ضمیر پر طاری ہونے والی سکون کی کیفیت کو دیکھتا ہے تو وہ اللہ کر رحمت اور قربت کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔

ہر آدمی فلم دیکھتا ہے اور مناظر کی نوعیت سے وہ فلم دیکھ کر کبھی قہقہے لگاتا ہے اور کبھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ کبھی آنسوؤں سے رونا شروع کر دیتا ہے حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ جو فلم میں دیکھ رہا ہوں وہ کسی کی لکھی ہوئی کہانی ہے۔ اعراف (مرنے کے بعد قبر کی زندگی) میں جب آدمی یہ دیکھتا ہے کہ میں چوری کر رہا ہوں اور میرا ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے تو اس منظر کو دیکھ کر وہ بدحواس ہو کر رونے چیخنے لگتا ہے۔ چوں کہ فلم پوری زندگی کی ہے اس لئے جب دوسرے اعمال کی فلم دیکھتا ہے تو ہاتھ کٹنے کی اذیت بھول جاتا ہے اور پھر جب چوری کی فلم کے مناظر سامنے آتے ہیں تو آدمی رونے لگتا ہے اور یہ صورت یوم حساب قائم ہونے تک رہے گی۔

یوم انصاف کے بعد جنت دوزخ کے مراحل ہیں۔ اللہ رحیم و کریم ہیں۔ حضو علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد ہے

ایک دن دوزخ کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔

دعا گو عظیمی

جنوری ۱۹۹۰

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

جناب الشیخ عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمۃاللہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

بھوت پریت، آسیب اور ڈائن وغیرہ کے الفاظ عام طور سے بولے جاتے ہیں لیکن اس کی تحقیق مقصود ہے۔

(خط ارسال کنندہ نے اپنا نام اور پتہ تحریر نہیں کیا)۔

نام۔ نامعلوم

وعلیکم السلام ورحمۃاللہ

آپ نے قبرستان میں دیکھا ہوگا کہ جب قبر تختوں سے بند کردی جاتی ہے تو میت کے ساتھ جانے والے سوگوار ہاتھوں میں مٹی لے کر قبر کے اندر ڈالتے ہین۔ مذہب کا کوئی عمل لایعنی اور ذائد نہیں ہو سکتا۔ مٹی ڈالتے وقت جو آیت تلاوت کی جاتی ہے وہ بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے انتہائی توجہ طلب ہے۔

انسان تین پرت کا مجموعہ ہے، ہر پرت متعین صفات رکھتا ہے۔ ہم ان پرتوں میں سے ایک پرت کو ہمزاد، ہیولیٰ، ایتھر، جسم مثالی اور نسمہ کہتے ہیں۔ جس وقت گوشت پوست کے آدمی کو قبر کے اندر اتارا جاتا ہے اس وقت نسمہ بھی اس کے ساتھ چپکا ہوا ہوتا ہے اور چونکہ وہ باشعور، باصلاحیت اور بااختیار ہوتا ہے اس وجہ سے فرشتے ایک خاص انتظام کے تحت اس بات کی نگرانی کرتے ہیں کہ نسمہ راہ فرار اختیار نہ کرے۔ بعض نسمہ اتنے چالاک ہوتے ہیں کہ وہ فرشتوں کو چکمہ دے کر اعراف کی حد بندی سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اس عمل سے ان کی کوئی جائے قیام متعین نہیں ہوتی اور وہ آوارہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ طبیعت میں شرارت کی وجہ سے لوگوں کو پریشان اور ہراساں کر کے خوش ہوتے ہیں۔

ان کو ہمیشہ ایسے لوگوں کی تلاش رہتی ہے جو دماغی اعتبار سے کمزور ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اس آدمی کے نسمہ میں قوت مدافعت نہ ہونے کے برابر ہے تو یہ ان کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔ دماغی عارضہ (مالیخولیا وغیرہ) بھی نسمہ میں قوت مدافعت نہ ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں لیکن ان بیماریوں کا سایہ، آسیب سے کوئی تعلق نہیں۔

عرض یہ کرنا ہے نوع انسانی نے نادیدہ مخلوق جنات کو بدنام کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا ہے کہ آدمی کے اوپر جن سوار ہو جاتا ہے، آدمی کے اوپر جن نہیں بلکہ خود آدمی (بھٹکا ہوا نسمہ) سوار ہوتا ہے۔ نوع اجنہ کے حق میں آدمی کی یہ بہت بڑی زیادتی اور ظلم ہے کہ بغیر تحقیق کے پوری نوع کے اوپر بہتان تراشی کی جائے۔

میں نوع اجنہ سے واقفیت کی بناء پر یہ بات یقین کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جنات ہم انسانوں سے زیادہ سنجیدہ، رحم دل، ہمدرد، ایثار پیشہ اور غم خوار ہوتے ہی۔ جنات کے بارے میں اس قسم کی جتنی کہانیاں مشہور ہیں ان کے راوی، ایسے آدمی ہیں جو احساس کمتری یا دنیا طلبی میں مبتلا ہیں، ہوتا یہ ہے کہ جب ہم کسی مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے تو اس کے لئے قیاس کو استعمال کر کے غلط فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔

دعا گو

عظیمی

اگست ۱۹۹۰

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

جناب الشیخ عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ روحانی علوم سیکھنے کے لئے کسی استاد کی شاگردی اختیار کرنا ضروری ہے مگر ہم کسی انسان کے بارے میں کیسے تعین کریں کہ فلاں شخص واقعی روحانی علوم سکھا سکتا ہے۔اور وہ روحانی علوم پر عبور رکھتا ہے۔

جمال الدین (لندن)

جمال الدین صاحب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

اللہ نے ہر مرد عورت کو روحانی علوم سیکھنے کی صلاحیت ودیعت کی ہے لیکن دیگر صلاحیتوں کی طرح اس صلاحیت کو بھی بیدار کرنے اور بروئے کار لانے کے لئے ایک قاعدہ قانون ہے۔

قانون کے مطابق وہی بندہ رہنمائی کر سکتا ہے جو بذات خود قانون سے واقفیت رکھتا ہو اور مذکورہ صلاحیت خود اس کے اندر بیدار ہو۔

آج کے دور میں روحانی استاد اور شاگرد کے رشتہ کا قیام جسے عرف عام میں پیری مریدی کہتے ہیں ایک رسم بن گیا ہے۔لوگ شکل وصورت دیکھ کر اور یہ دیکھ کر اس آدمی کے بے شمار مرید ہیں، مرید بن جاتے ہیں لیکن تحصیل علم کے سلسلہ میں نتیجہ زیادہ تر صفر ہی ہوتا ہے۔وجہ ظاہر ہے اس تعلق خاطر کی بنیاد رسم کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ بیعت کرنے میں جلد بازی سے کام لینا نہیں چاہئے۔پہلے ہر طرح سے اس بات کا اطمینان کر لیا جائے کہ وہ بندہ جس کے ہاتھ میں ہم اپنا ہاتھ دے رہے ہیں روحانیت کے قانون سے واقفیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ قانون بھی بنایا ہے کہ ایک دفعہ بیعت کرنے کے بعد کوئی آدمی اپنی مرضی سے بیعت توڑ نہیں سکتا۔رسول اللہ کے اس ارشاد اقدس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی بندہ جب اللہ کے راستے پر قدم بڑھائے تو اس کے اندر یقین مستحکم ہونا چاہئے۔اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ

پہلے روحانی استاد کو پرکھ لیا جائے اور اس کے ہاتھ پر بیعت ہونے سے پہلے یقین کی حد تک اس بات کا اطمینان کر لیا جائے کہ اس آدمی میں روحانی صلاحیتیں موجود ہیں اور ان صلاحیتوں کا استعمال بھی جانتا ہے؟

زندگی کی عام طرزوں میں بھی ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ایسے استادوں کے سپرد کرتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ استاد ہی صحیح معنوں میں ہمارے بچے کی تعلیم و تربیت کرے گا۔ اسی طرح روحانی استاد بنانے میں بھی یقین ہونا ضروری ہے۔ چونکہ روحانی علم کا حصول اور غیب بینی کی صلاحیت کا بیدار ہونا یقین پر منحصر ہے اس لئے استاد کے معاملے میں بے یقینی سے آدمی روحانی راستے میں سفر نہیں کر سکتا۔

روحانی علوم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم کا نام استدراج ہے جس کے ضمن میں جادو وغیرہ آتے ہیں اور دوسرے علم کا نام روحانیت یا رحمانی علوم ہیں۔ علم استدراج اللہ کی نافرمانی، اللہ کی مخلوق کو تکلیف پہنچانے اور دنیا میں تخریب پھیلانے، خرق عادت سے اپنی نمائش کرنا ہے۔

اس کے برعکس اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے، اللہ کا عرفان حاصل کرنے اور اپنی روحانی صلاحیت اور طاقت سے اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچانے والے تمام روحانی علوم اللہ سے ہم رشتہ ہیں۔ جس طرح کوئی بندہ قدم قدم سفر کر کے اللہ کا عرفان حاصل کرتا ہے اسی طرح کوئی بندہ اس راستے کے متضاد قدم قدم سفر کر کے شیطان کا عرفان حاصل کرتا ہے۔ شیطان کے عارف استدراج کے عامل کہلاتے ہیں۔

روحانیت کے یہ دو رخ بیان کرنے کا منشاء یہ ہے کہ اللہ کے راستہ پر چلنے کے لئے انسان کو پہلے چھان بین کر لینی چاہئے کہ جس بندے کو ہم اپنا رہنما یا پیر و مرشد تسلیم کر رہے ہیں اس کے اندر روحانی علوم سکھانے کی صلاحیت موجود ہے یا نہیں اور کیا روحانی علوم کا وہ رخ اس کے اندر کام کر رہا ہے جس کو استدراج یا شیطانی علوم کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ استدراج کے ماہرین سے فوق العادت سرزد ہوتی ہیں جنہیں ناواقف لوگ کرامت یعنی رحمانی قوتوں کا اظہار سمجھ لیتے ہیں۔

کسی پر اعتراض کرنا مقصود نہیں، بتانا یہ ہے کہ عرفان کے راستہ پر قدم اٹھانے سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لینا ضروری ہے کہ وہ بندہ جسے آپ اپنا رہنما بنا رہے ہیں وہ اللہ کا عرفان رکھتا ہے یا نہیں اور اس کی زندگی کے شب و روز بظاہر ہی نہیں باطنی طور پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی زندگی سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ کتنا ہی طویل عرصہ کیوں نہ گزر جائے جب تک ایسا بندہ نہ ملے جو واقعتاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روحانی علوم سے واقفیت رکھتا اور حضور ﷺ کے نقش قدم پر چلتا ہو بیعت نہیں کرنا چاہئے اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کسی بندے کے اندر کیا بھرا ہوا ہے اس سے قریب ہونا پڑے گا اس کے شب و روز پر نگاہ رکھنی ہوگی، اس کے معاملات کو دیکھنا ہوگا۔

اس کے ذہن کو پڑھنا ہوگا کہ وہ دنیا کی ہوس میں کہاں تک مبتلا ہے۔ اس کے اندر استغناء ہے یا نہیں اور وہ اپنے ذاتی معاملات اللہ اوپر چھوڑتا ہے یا بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

ایسے بندہ کی ایک پہچان اللہ کے دوستوں نے یہ بتائی ہے کہ ایسے بندہ کے پاس بیٹھنے سے ذہن پوری استعداد اور صلاحیتوں کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ گناہوں اور تخریبی عمل سے ذہن میں دوری واقع ہونے لگتی ہے۔ اللہ کی مخلوق کی محبت دل میں جانگزیں ہو جاتی ہے۔ غصہ، نفرت جیسے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔

دعا گو

عظیمی

۱۴ دسمبر ۱۹۹۰

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

اقبال قریشی صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بات کچھ اس طرح ہے کہ ایک آدمی کے لئے پیدا کرنے والی ہستی نے ایک لاکھ روپے جمع کرائے۔اس طرح جیسے ایک لاکھ روپے کسی بینک میں جمع کرادیئے جاتے ہیں۔وسائل کو استعمال کرنے کے لئے آدمی کو شش اور جدوجہد کرتا ہے۔کوشش اور جدوجہد جیسے جیسے کامیابی کے مراحل طے کرتی ہے اس کو روپیہ ملتا رہتا ہے اور ضروریات پوری ہوتی رہتی ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ اگر کائناتی فلم (لوح محفوظ) میں وسائل کا ریکارڈ اور زر مبادلہ متعین نہ ہو تو ڈسپلے (Display) ہونے والی فلم نامکمل رہے گی۔

ایک آدمی کے نام بینک میں کروڑوں روپے کا زر مبادلہ موجود ہے لیکن اگر وہ اسے استعمال نہ کرے تو یہ زر مبادلہ کام نہیں آئے گا۔کوشش اور جدوجہد دراصل چیک کی حیثیت رکھتی ہے۔جس طرح چیک لکھ کر بینک سے روپیہ نکلوایا جاتا ہے.....اسی طرح معاش کے حصول میں جدوجہد..... لوح محفوظ سے وسائل حاصل کرنے کے لئے کیش چیک ہے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

مارچ ۱۹۹۲ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

اشفاق عنبر عظیمی صاحب!

جو لوگ اللہ کے راستہ پر مخلصانہ طرزوں پر قدم بڑھاتے ہیں اللہ ان کو ضرور ہدایت بخشتا ہے اور اپنے تک پہنچنے کے بے شمار راستوں میں سے راستہ دکھاتا ہے۔

ہمیشہ ضمیر کی آواز پر دھیان رکھنے والے بندے غلطیاں کم کرتے ہیں۔

ضمیر انسان کے اندر نور باطن ہے۔

نور باطن سے ہر انسان کا متعارف ہونا ضروری ہے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

۵، جولائی ۱۹۹۲ء

مرشد کریم کو تہہ دل سے سلام..... السلام علیکم ورحمتہ اللہ

دل آپ کے ساتھ گزرے لمحوں کی گرفت میں رہتا ہے۔جب سامنے ہوتا ہوں تو ہر سوال بے معنی ہو جاتا ہے۔بس خود کو نثار کرنے کی خواہش ہوتی ہے لیکن جب اپنی دنیا میں واپس آتا ہوں تو وہی سوال گھیر لیتے ہیں۔

مرشد اور مرید کے رشتہ کو میں اس طرح سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ تعفن میں رینگتے ہوئے کیڑے کو اللہ کا ایک دوست روشنی کے سانچے میں ڈال دیتا ہے اور تربیت کرتا ہے،اس کے اندر کے تعفن کو دھوتا ہے اور جب کیڑا پوری طرح صاف ہو جائے تو اس کو تتلی بنانے کے لئے توانائی فراہم کرتا ہے۔ جب مرشد کی محنت سے مرید تتلی بن کر اللہ میاں کے اس باغ کائنات میں اڑنے کو تیار ہوتا ہے تو مرشد اپنی نگرانی میں اڑنا سکھاتا ہے۔

لیکن یہ دن جو کیڑے کو تتلی بننے میں گزرتے ہیں،اس میں بہت سے سوال اٹھتے ہیں اور کیڑے کے ذہن پر بوجھ ڈالتے ہیں۔کیڑا باخبر ہے کہ وہ تتلی بن رہا ہے لیکن ڈر ہے کہ وہ تتلی بن پائے گا یا نہیں..... وہ جانتا ہے کہ شک شیطان کا ہتھیار ہے پر کبھی کبھی وہ شک کے بھنور میں پھنس جاتا ہے۔

تربیت شروع ہوتی ہے تو ایک وقت آتا ہے کہ وہ کوئلہ رہتا ہے نہ ہیرا..... اس وقت نہ کوئلے کی کان میں اسے اپنایا جاتا ہے نہ ہیرے کے ساتھ سجایا جاتا ہے۔وہ اکیلا اور پریشان رہتا ہے جلتی بجھتی امید کے ساتھ۔

ایسے میں پچھلی زندگی کی طرف دیکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو کب کی چھوٹ گئی ہے اور آگے دیکھتا ہے تو خدشات ابھرتے ہیں کہ معلوم نہیں ہیرا بننے میں کتنی دہائیاں لگیں۔نہ پرانی سوچ سے پوری طرح آزادی ہے نہ نئی سوچ میں پوری طرح رنگا ہوا ہوتا ہے۔لگتا ہے کہ کیڑا سمندر کی لہروں پر سوار ہے۔

کبھی اچھے دن ہوتے ہیں اور کبھی خوف طاری ہو جاتا ہے۔کبھی باخبری کے لمحات ہوتے ہیں اور کبھی واقفیت کا لامتناہی سلسلہ!میری حیثیت کیڑے جتنی بھی نہیں لیکن درخواست ہے کہ میں بے رنگ ہونا چاہتا ہوں تاکہ..... مرشد کے رنگ میں رنگ جاؤں۔نہ میں کوئلا رہا ہوں،نہ اب تک ہیرا بن سکا ہوں۔میرا ایک ہی مقام ہے کہ آپ کے قدموں میں رہنا ہے۔چاہتا ہوں کہ ہر روز میری ''میں'' قربان ہو۔

پروانہ دل کا شمع کی روشنی میں ہے۔دعا کیجئے کہ اس روشنی میں جلنے کی تڑپ کبھی نہ بجھے.....

آپ کو بہت یاد کرتا ہوں..... ایک بار پھر تہہ دل سے سلام!

نیاز مند

سندر سنگھ

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

ایک روحانی بندہ کے دو شاگرد تھے۔ایک شاگرد دوڑ دوڑ کر مرشد کے کام کرتا تھا۔کچھ عرصہ بعد اس کے دماغ میں ایک روزن کھلا۔اس روزن میں اس نے فلم دیکھی۔ فلم کے کردار دو زاویوں، دو کرداروں پر مشتمل تھے۔کانٹوں بھرے گلستان سے تیز ہوا آئی اور پورے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔کرنٹ کو سمجھنا چاہا تو خیال تو خیال آیا کہ ہم دونوں شاگرد، بھائی ہیں اور دونوں کے مرشد ایک ہیں۔میں ہر وہ کام کرتا ہوں جس کے لئے محسوس کرتا ہوں کہ یہ مرشد کی خدمت ہے لیکن خدمت کا صلہ وہ نہیں ملتا جو میرے بھائی شاگرد کو ملتا ہے۔

یہ خیال بجلی کی طرح جسم میں دوڑ گیا..... الوژن(illusion)سوچ تمام خیالات پر غالب آگئی۔شاگرد نے مرشد سے عرض کیا، میں اتنے سال سے آپ کی خدمت کر رہا ہوں، مجھے میرا حصہ دے دیں۔

مرشد نے کہا، بیٹا! تم نے مکھن دیکھا ہے.....

شاگرد نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا، جی ہاں دیکھا ہے

مرشد نے پوچھا، مکھن کہاں سے نکلتا ہے.....

شاگرد نے بتایا، دودھ سے

مرشد نے پوچھا، دودھ میں سے کب نکلتا ہے.....

شاگرد نے عرض کیا، دودھ بلونے سے

بیٹا! اب اصل بات شروع ہوتی ہے۔دودھ کا سورس(Source)کیا ہے.....

شاگرد نے عرض کیا، جناب! دودھ کا سورس گائے ہے

مرشد نے فرمایا، اور گائے جہاں سے بھی آتی ہے ہم نہیں جانتے جب کہ ہماری ظاہری آنکھیں گائے کی پیدائش اور اس کے وجود کو دیکھتی ہیں۔گائے کے بچہ کے لئے گائے ماں بنتی ہے اور ماں اپنے بچوں کو توانائی فراہم کرتی ہے۔توانائی کے لئے ضروری ہے کہ توانائی حاصل کرنے کے وسائل مہیا ہوں۔ وسائل سے مراد آنکھوں دیکھا وسیلہ یہ ہے: گائے کا وجود..... گائے کا ماں بننا اور..... تھنوں سے دودھ اترنا۔

بیٹا سوچو! ذہن کو آزاد کرو۔صرف اس بات کا کھوج لگاؤ کہ اس کی ایکویشن(Equation)کیا بنی..... میں نہیں بتاتا۔ہمارے اندر جو فہم ہے ہم سب کو بتاتی ہے۔ایک شاگرد، مرید یا چیلے کو مکھن کب حاصل ہوا.....

ہمارا دماغ، ذہن، فہم سوچ کا خزانہ ہے۔جب ہم اپنی سوچ کے خزانہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں کس بات پر دھیان ہوتا ہے..... مرید ہاتھ باندھ کر رونے لگا اور مرشد کے تخت پر رکھ دیا۔

مرشد نے ایک اور دراز کھولی..... مکھن کہاں ہوتا.....

شاگرد نے عرض کیا..... جناب! دودھ میں

پوچھا، دودھ میں سے مکھن کا وجود کب ظاہر ہوتا ہے.....

مرید حواس باختہ ہو گیا۔ مرشد نے مرید کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور کہا،

بیٹا! دودھ بلونے سے

خلاصہ: مرشد.....شاگرد.....شاگرد کا انتخاب.....مرشد کا انتخاب

گائے کا بچہ کو پالنا.....پرورش کرنا

گائے کا ماں بننا..... دودھ اترنا

(دودھ کا فارمولا آپ بتائیں، دودھ بنتا کیسے ہے.....)

اللہ تعالیٰ کے نظام میں دودھ کی ایک ایکویشن اور ایک فارمولا ہے اور یہ فارمولا بچہ کی صحت کا امین ہے۔ اس مثال سے سمجھو..... پرندے درخت پر بیٹھے ہیں، کسی نے بندوق سے فائر کیا، بیٹا بتاؤ کیا ہو گا..... یاد رکھو! زندگی کا ہر مرحلہ ایثار ہے۔ ایثار سے گزر کر زندگی..... بندگی بنتی ہے۔

دعا گو

عظیمی

۱۳، اکتوبر، ۱۹۹۲ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

گزشتہ چار سالوں سے آپ کے مضامین، نظریہ رنگ ونور، مسائل کے حل کے علاوہ دیگر کتب یعنی روحانی نماز، روحانی علاج، ٹیلی پیتھی سیکھئے کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ آپ روحانی علوم کی باقاعدہ اور مسلسل تشریح کرنے کے ساتھ ایسی ایسی باتیں بتاتے ہیں جو میری سمجھ سے بالا لیکن وہ راز و نیاز کی باتیں اور روحانی دنیا کی باتیں ہیں۔ اب تک میں جن روحانی حضرات سے ملا ہوں وہ ان باتوں کے اظہار سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کا منع کرنا اور آپ کا اظہار کرنا..... اس کی کوئی خاص وجہ ہو گی۔

آپ کے بصیرت افروز مضامین سے جو تھوڑا بہت میں سمجھ سکا وہ یہ ہے کہ ہر شے کی بنیاد امر ہے، جو روشنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ روشنی..... معین مقداریں ہیں، ان سے علم حاصل کر کے انسان روح سے واقف ہوتا ہے اور زندگی کے مقصد کو پالیتا ہے۔ کتاب ''ٹیلی پیتھی سیکھئے'' میں نمک اور مٹھاس پر طویل اور بصیرت افروز مضمون سے کافی معلومات حاصل ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ محسن انسانیت اور روحانیت کے سرچشمہ ہیں اور آج یا بعد میں جو صاحبان اس راہ کے مسافر ہوں گے سب آپ ﷺ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور چلتے رہیں گے۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ حضور پاک ﷺ کو شہد کتنا پسند تھا۔ شفایابی کے بارے میں کس قدر ارشادات فرمائے ہیں۔ جاننا چاہتا ہوں کہ جب مٹھاس شعوری قوتوں کو ترقی دیتی ہے اور نمک لاشعوری قوتوں کو تو پھر نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں شہد کے استعمال کی کیا حکمت ہے۔

شکریہ..... اللہ کرے زور قلم اور زیادہ.....

محمد اعجاز خان ایڈوکیٹ

عزیز گرامی قدر!

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

سید محمد عظیم برخیا قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ، امام سلسلہ عظیمیہ کے ارشاد کے مطابق ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے ماورائی کیفیات کو چھپانے کا اہتمام اس لئے کیا ہے کہ انسانی شعور کمزور اور ناتواں تھا۔ اب جب کہ سائنسی ایجادات و ترقی نے شعور کو توانا کر دیا ہے اور فہم و فراست عام ہو گئی ہے، اس لئے ابدال حق حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی جانب سے اپنے نانا حضرت تاج الدین ناگپوری رحمتہ اللہ کی اجازت سے روحانی علوم کو منظر عام پر لانے کی جدوجہد کی جارہی ہے۔

کتنی کامیابی ہوتی ہے، کب ہوتی ہے، یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمارا کام روحانی علوم کی ترویج کے لئے تن من دھن سے لگے رہنا ہے، صرف اللہ اور اس کے محبوب ﷺ کی رضا اور خوشنودی کے لئے۔

نمک اور مٹھاس دونوں کی اہمیت ہے۔ مٹھاس کی قسمیں ہیں۔ مٹھاس میں سب سے زیادہ لطیف، پاکیزہ مٹھاس شہد ہے۔ شہد ایسی مٹھاس ہے کہ جس سے شعور انسانی کو اس طرح تقویت ملتی ہے کہ وہ لاشعوری واردات و کیفیات کو قبول کرنے میں تھکن محسوس نہیں کرتا۔ اس کے برعکس دوسری مٹھاس مثلاً گڑ، چینی اور شوگر سے بنے ہوئے دیگر مرکبات شعور پر بوجھ بنتے ہیں اور شعور، لاشعوری کیفیات کو قبول کرنے میں کمزوری محسوس کرتا ہے۔

آپ غور کریں ہم جو کچھ کھاتے ہیں ان سب میں مٹھاس ہے۔ گیہوں، چنا، باجرا، جوار، جو، پھل، دودھ، پانی، ترکاریاں..... مطلب یہ ہے کہ ہماری غذا میں اتنا مٹھاس ہے کہ ہمیں اضافی مٹھاس کی ضرورت نہیں ہے۔

البتہ شہد چونکہ لطیف، پاکیزہ اور اللہ کے فرمان کے مطابق شفا ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے شہد کو پسند فرمایا اور اسے کھانے کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

میں شہد کی مکھی پر وحی کرتا ہوں۔ سورہ النحل

شہد میں وحی کی نورانیت موجود ہے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

جون ۱۹۹۳ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

السلام علیکم

حدیث قدسی میں مومن کے بارے میں آیا ہے کہ اللہ فرماتے ہیں:

میں مومن کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ چیزیں پکڑتا ہے، میں وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں وہ سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں وہ ذہن بن جاتا ہوں جس سے وہ سوچتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مومن کی جن صفات اک ذکر کیا گیا وہ ساری مخلوق میں پائی جاتی ہیں یعنی سماعت، سوچ وغیرہ تو پھر ایک عام آدمی اور مومن میں کیا فرق ہے..... شکریہ

آصف کامران (کینیڈا)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

یہ آپ نے بڑا عجیب سوال کیا ہے۔ اگر آپ تھوڑا غور کرتے تو یہ سوال دوسری طرح ہوتا۔ آپ کا سوال یہ ہوا کہ میٹرک کرنے والے اور Ph.D میں کیا فرق ہے..... حالانکہ میٹرک کرنے والا بندہ بھی روٹی کھاتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے، عقل کی باتیں کرتا ہے، کاروبار کرتا ہے، اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو پہچانتا ہے اور علم بھی رکھتا ہے..... لیکن ایک Ph.D میں، ایک گریجویٹ اور میٹریکولیٹ میں بہت فرق ہے۔

ان سب میں فرق علم کا ہے۔ جتنا علم ہوگا اسی مناسبت سے کسی بھی شخص کا دماغ اور ذہن روشن ہو جائے گا۔ یہی فرق عام آدمی اور مومن میں ہے۔ مومن اور عام آدمی کے فرق کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔

ان سے کہو تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری اختیار کر لو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ الحجرات: ۱۴۔۱۰

اللہ فرماتے ہیں

اور تم نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جس وقت کہ پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی۔ الانفال: ۱۷

قرآن کریم تخلیقی فارمولوں کی دستاویز ہے۔ تخلیقی فارمولے وہ علوم ہیں جن کی بنیاد پر آدم نے اپنا نائب بنایا۔ جب تک نوع آدم قرآن کریم میں موجود تخلیقی فارمولوں کا علم حاصل نہیں کرے گی۔ وہ مخلوقات میں اشرف نہیں بلکہ اسفل سافلین میں ہے۔ اللہ فرماتے ہیں۔

الف، لام، میم۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں شک نہیں۔ ہدایت ہے متقیوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ صلوۃ قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان (یقین) لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ البقرۃ۔ ا۔ ۵

مومن کے بارے میں حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے

مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

عام آدمی اور مومن میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مومن کو اللہ کی طرف سے ایسی نظر عطا ہو جاتی ہے کہ نور سامنے آجاتا ہے اور وہ جو کچھ دیکھتا ہے..... انوار و تجلیات کی روشنی میں دیکھتا ہے۔

اللہ بتا رہے ہیں کہ مومن کوئی چیز سنتا ہے تو وہ میری معرفت سنتا ہے..... وہ دیکھتا ہے تو میری معرفت دیکھتا ہے۔ کہیں جاتا ہے تو میری معرفت پیروں سے چل کر جاتا ہے یعنی جو کام بھی کرتا ہے میری خوشنودی کے لئے کرتا ہے۔ کسی بات کو بیان کرنے کا بھی ایک طریقہ ہے۔ اللہ آنکھ بن جاتا ہے کا مطلب یہ ہے کہ اسے اللہ ایسی بصیرت عطا کر دیتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس دیکھنے میں اللہ کی مشیت ہوتی ہے اور وہ کوئی ایسی چیز نہیں دیکھتا کہ جس چیز کے دیکھنے میں اللہ ناخوش ہوتے ہیں۔ وہ کسی ایسے راستہ پر قدم نہیں بڑھاتا کہ جس پر قدم بڑھانے سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہوتے ہیں۔ وہ کوئی ایسی چیز ہاتھ میں نہیں پکڑتا جسے اللہ نے ناپسند کیا ہے۔ مثلاً ایک آدمی سودی کاروبار کرتا ہے، سودی کاروبار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب رقم آئے گی تو آدمی ہاتھ سے ہی پکڑے گا۔

ایک آدمی شراب خانہ کی طرف چلتا ہے، ایک آدمی مسجد کی طرف چلتا ہے، وہ اگر شراب خانہ کی طرف چل رہا ہے تو اللہ ناخوش ہے اور اگر وہی آدمی مسجد کی طرف جا رہا ہے تو اللہ خوش ہے..... ایک آدمی شراب خانہ کے بجائے مسجد کی طرف یا مکہ کی طرف یا مدینہ کی طرف سفر کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا سارا چلنا اللہ کا چلنا ہوا، اس لئے کہ اس نے اللہ کی خوشنودی کے لئے قدم اٹھایا ہے۔

یہی ''ذہن'' ہے۔ مومن جب سوچتا ہے تو اس کی سوچ میں رحمانیت ہوتی ہے، شیطنیت نہیں۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندہ جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ ہاتھ بن جاتا ہوں، کان بن جاتا ہوں، وہ بندہ ہے جو مکمل اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے۔ حضور پاکؐ کا ارشاد ہے کہ

اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ جب اللہ کے بھروسے پر کوئی بات کہہ دیتے ہیں تو اللہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے اور وہ بات پوری ہو جاتی ہے۔

دعا گو

عظیمی

اگست ۱۹۹۳ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ کی ایک تحریر نظر سے گزری جس میں آنے دن اور رات کا تعلق روحانیت سے جوڑا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں بنایا۔ ظاہر ہے کہ ان ایام کا تعلق مادیت سے ہے۔ وضاحت فرمادیں۔

شکریہ

تسنیم اقبال

(سوال مختصر کر کے لکھا گیا ہے)

عزیز مکرم بھائی تسنیم اقبال صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

میرے محدود علم کے مطابق قرآن پاک تین عنوانات کی دستاویز ہے۔ ہر عنوان میں اجمال بھی ہے اور تفصیل بھی۔ وہ تین عنوانات یہ ہیں۔

۱۔ معاشرہ

۲۔ تاریخ

۳۔ معاد

میرے جس مضمون کے اوپر آپ نے نہایت محققانہ، عالمانہ گرامی نامہ تحریر فرمایا ہے وہ معاد کے تحت لکھا گیا ہے۔ قرآن پاک میں دو حواس کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے اور یہ دو حواس قرآن پاک کی زبان میں ''لیل'' اور ''نہار'' (دن، رات) ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان پر ایک وقت گزرا ہے جب وہ ناقابل تذکرہ شے تھا، ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور وہ سنتا، دیکھتا ہو گیا۔

روح جب تک مادی اجسام میں میں خود کو متحرک یا اپنا میڈیم بنائے رکھتی ہے، حرکت قائم رہتی ہے۔ جیسے ہی روح مادی وجود سے رشتہ منقطع کر لیتی ہے، مادی وجود کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں جو بھی پیدا ہوتا ہے بالآخر مر جاتا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے یعنی روح، جسم سے رشتہ منقطع کر لیتی ہے تو باوجودیکہ تمام اعضاء موجود ہوتے ہیں، حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح کہیں گے کہ مادی وجود کا قیام اس وقت تک ہے جب تک روح اسے سنبھالے رکھتی ہے۔ مثال دینے کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے اس لئے ایک مثال پیش خدمت ہے.....

مادی جسم کی حفاظت کے لئے، مادی جسم کے آرام کے لئے اور مادی جسم کی زینت کے لئے انسان لباس بناتا ہے۔ لباس اون کا ہو، سوت کا ہو یا کسی بھی چیز کا ہو..... روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جسم کے اوپر قمیض جب تک ہے آستین ہلتی ہے..... لباس چارپائی پر ڈال دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ حرکت کرو تو کسی قسم یک حرکت نہیں ہوتی جیسے روح کے بغیر مادی جسم میں حرکت نہیں ہوتی۔ مثال سے یہ ثابت ہوا کہ مادی جسم دراصل روح کا لباس ہے۔ ایسا لباس جو روح کے بغیر کھاتا ہے نہ پیتا ہے، سوتا ہے نہ جاگتا ہے اور حرکت کرتا ہے یعنی انسان کی اصل اس کی روح ہے، مادی جسم نہیں۔ مادی جسم ہیولا ہے۔ ایسا ہیولا جو ذاتی حیثیت میں قائم نہیں بلکہ روح کے تابع ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ

ہم رات کو دن میں داخل کر دیتے ہیں اور دن کو رات میں داخل کر دیتے ہیں۔ رات کو دن پر سے ادھیڑ لیتے ہیں اور دن کو رات پر سے ادھیڑ لیتے ہیں۔ رات کو دن میں سے نکالتے ہیں اور دن میں سے رات کو نکالتے ہیں۔

دراصل یہ شعور کی درجہ بندی کا تذکرہ ہے۔ انسان کے اندر ہمہ وقت ''معاد'' کے نکتہ نظر سے دو حواس یا دو شعور ہر وقت کام کرتی رہتے ہیں۔ ایک حواس یا شعور کا نام دن ہے اور دوسرے حواس یا شعور کا نام رات ہے۔ رات کے حواس میں انسان زمان اور مکان سے آزاد زندگی بسر کرتا ہے..... دن کے حواس میں انسان زمان اور مکان میں بند زندگی گزارتا ہے۔ دن کے حواس عارضی اور فکشن ہیں جو مرنے کے بعد معطل ہو جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد بندہ مادی حد بندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مٹی کے ذرات سے بنے ہوئے جسم کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔

عزیز محترم تسنیم اقبال صاحب! آپ نے پتہ نہیں کس طرح ایام کو مادیت سے تعبیر کیا ہے..... اگر آپ اس بات کی تشریح کر دیتے کہ چھ ایام میں مادیت کا کیا عمل دخل ہے اور ہم ایام کو کس طرح مادی وجود میں بیان کر سکتے ہیں تو بڑا کرم ہوتا۔ اگر یہ بات طے ہو جاتی کہ چھ ایام مادی تخلیق کی دلیل ہیں تو یہ بات بھی سامنے آجاتی کہ سات آسمانوں کی کیا حیثیت ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے کہ ہم نے قرآن کریم میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات کی وضاحت کر دی ہے۔ مجھے اس بات پر بہت خوشی ہے کہ اللہ نے آپ کو بہت روشن دماغ عطا کیا ہے۔ آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ قرآن کریم میں ''معاد'' کے عنوان کے تحت بھی تفکر فرمائیں۔

میں بہت چھوٹا سا اور محدود علم رکھنے والا بندہ ہوں، علمی موشگافیوں کا مجھے نہ تجربہ ہے اور نہ ہی اپنے اندر اتنی صلاحیت دیکھتا ہوں کہ بال کی کھال نکال لاؤں۔ پیرومرشد کی ضرورت کا جہاں تک تعلق ہے اس کے پیچھے یہ دلیل ہے..... کوئی بھی علم استاد کے بغیر نہیں سیکھا جا سکتا۔

''معاد'' کا علم چونکہ رات کے حواس سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ہمیں اگر رات اور دن کے حواس کے بارے میں، چھ دن اور سات آسمانوں کے بارے میں، عرش، بیت المعمور، سدرۃ المنتہیٰ، کتاب المبین، حجاب عظمت، حجاب کبریا، حجاب محمود، مقام محمود، تجلی اور تدلی کے بارے میں علم سیکھنا ہے تو ہمیں مرشد کی ضرورت ہو گی اور اگر ہم یہ علم نہ سیکھنا چاہیں، مرشد کی کوئی ضرورت نہیں۔

اللہ آپ کے علم میں مزید اضافہ فرمائے اور ہم سب کو دنیاوی علوم کے ساتھ روحانی علوم (معاد) سیکھنے کی صلاحیت عطا کرے۔ آمین

مرسلہ گرامی نامہ کے جواب میں تاخیر کی بہت ساری وجوہات ہیں

O کراچی/ملک سے باہر قیام O بیماری اور ذاتی مصروفیات

O چوتھی بین الاقوامی روحانی کانفرنس کی تیاری اور اس کا انعقاد O دوسری سالانہ روحانی ورکشاپ

امید ہے کہ آپ میری معذرت کو قبول فرمائیں گے۔ خصوصی اوقات میں آپ سے دعا کی درخواست ہے۔

دعا گو

عظیمی

۳،مارچ ۱۹۹۴ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

محمد زاہد وصی عظیمی

سلوک میں کئی راستوں اور پیچیدہ گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کیفیت سے آپ گزر رہے ہیں یہ راستہ کی ایک کیفیت ہے..... زیادہ فکر نہ کریں..... اس سے گزر جائیں گے ورنہ خدانخواستہ راستہ کھوٹا ہو جائے گا۔

کوشش کریں زیادہ سے زیادہ وضو، بے وضو یا حی یا قیوم کا ورد کریں اور کتاب محمد رسول اللہ کا مطالعہ کریں۔ قرآن پاک ترجمہ کے ساتھ پڑھیں..... انشاءاللہ ذہن نارمل ہو جائے گا۔

دعا گو

عظیمی

۱۵، اپریل ۱۹۹۴ء

محترم مرشد کریم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

''میں'' کئی عشرے قبل پیدا ہوا، پروان چڑھا اور ایک دن عمر گزار کر فنا ہو گیا۔ فنا کیا ہے اور میں کون ہوں..... یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ دور رہ کر مرشد کی قربت کیسے حاصل ہو۔

نیاز مند

سندر سنگھ۔ سوات

بہت پیارے دوست، سندر سنگھ

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

اللہ کی رحمت آپ کے اوپر چادر بنی رہے..... جسم و روح کا رشتہ آپ کی سمجھ میں آجائے۔ ''میں'' ہر آدمی بولتا ہے مگر ''میں'' کیا ہے کوئی نہیں سوچتا۔ ''میں'' اگر کوئی ہستی ہے تو فنا کیا چیز ہے۔ بڑے بڑے رشی، منی، گرو آئے..... سب نے ''میں'' کا کھوج لگایا۔ جب انہوں نے کچھ نہ پایا تو فنا کو قبول کر لیا۔

اس دنیا میں، مرنے کے بعد کی دنیا میں، جہاں کہیں دیکھو ''فنا'' کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں بھی فنا ہے تو وہاں بھی فنا ہے۔ ثابت یہ ہوتا ہے کہ فنا کے اوپر بھی فنا ہے..... فنا خود فانی ہے۔ کوئی کسی سے محبت کرتا ہے، کوئی کسی سے نفرت کرتا ہے۔ اسے یہ پتہ نہیں کہ محبت کیا ہے، نفرت کیا ہے تو پھر محبت، نفرت کا اعتبار کیا ہوا..... ہر شخص فانی چیزوں سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ ہر شخص فانی چیزوں سے نفرت کرتا ہے۔ جب چیز ہی عدم وجود ہے پھر یہ نفرت اور محبت کا اعتبار کیا معنی رکھتا ہے.....

''میں'' پیدا ہوتا ہے..... کیسے پیدا ہوتا ہے..... باپ کا نطفہ ماں کے رحم میں جب تک اپنا وجود ختم نہ کرے، ''میں'' نہیں بنتا..... ماں نو مہینے تک اپنے خون کو فنا کرتی رہتی ہے۔ بچہ پیدائش کے بعد ہر سیکنڈ، ہر لمحہ، ہر منٹ، ہر گھنٹہ، ہر دن، ہر ماہ فنا (غیب) ہوتا ہے تو ایک سال کا کہلاتا ہے۔ سند نہیں ہے کہ ایک سال کا ہو گیا ہے۔ یہ بھی علم نہیں لمحات، منٹ، گھنٹے کہاں چلے گئے۔

عزیز فرزند! پیارے دوست..... یہ دنیا بڑی عجیب گورکھ دھندا ہے۔ جس نے دنیا میں خود کو غرق کر دیا، پھر اس کا کہیں اتا پتا نہیں چلتا۔

یک موا گر ٹل جائے پاؤں

پھر کہیں ٹھور نہ ٹھاؤں

مطلب اگر بال برابر قدم ڈگمگا جائے تو ٹھکانے کی نشاندہی نہیں ہوتی۔

آپ نے اپنے من مندر میں جو مورتی سجائی ہے، آپ کہتے ہیں کہ محبوب کی صورت ہے۔ نہیں میرے بھائی! اندر اپنی ہی تصویر ہوتی ہے۔ آدمی تصویر میں، چونکہ تصویر آئینہ بن جاتی ہے، مرشد کی تصویر دیکھتا ہے۔ مرشد کیا ہے..... آدمی کے اندر اپنے آئینہ میں خود اپنی تصویر ہے۔

جو آدمی خود اچھا ہوتا ہے، اسے سب اچھے لگتے ہیں۔ جو آدمی خود اعتماد ہوتا ہے وہ دوسروں پر اعتماد کرتا ہے۔ شکی مزاج آدمی کو آپ نے کسی پر یقین کرتے دیکھا ہے..... دوست، مرید کو چاہئے کہ اپنا آئینہ اتنا صقیل کر دے کہ تصویر ہزاروں میل کے فاصلہ پر بھی ہو تو عکس قبول کرے۔

دعا ہے اللہ آپ کو خوش رکھیں، سکون دیں..... ذہنی پراگندگی دھل جائے۔ یہاں، وہاں اور وہاں سے اس پار..... سوائے اللہ کے نور کے کچھ نہیں۔

اول اللہ نور اُپایا

قدرت کے سب بندے

اک نور تے سب جگ اپجیا

کون بھلے کون مندے

(حضرت بابا گرونانک صاحب)

سب دوستوں کو سلام۔

دعا گو

عظیمی

۱۸، اپریل ۱۹۹۴ء

محترم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

ٹیلی پیتھی کے بارے میں وضاحت فرمادیں کہ یہ کیا علم ہے اور اس کی روحانی حیثیت کیا ہے..... ٹیلی پیتھی کا علم سیکھنے کے لئے استاد کا ہونا ضروری ہے یا آدمی خود کتابوں میں پڑھ کر مشقیں کر سکتا ہے.....

قندیل (ناروے)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

یہ ٹیلی پیتھی ہے! یہ جملہ عام طور پر اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب کوئی عجیب و غریب ذہنی واردات عام آدمی کی اپنی روزمرہ ذہنی روش کو جھنجوڑ کر رکھ دے۔ ٹیلی پیتھی کا لفظ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں چند لوگوں نے تجویز کیا جنہوں نے ایک سوسائٹی British Society of physical Research بنائی۔ ان کے سامنے مقصد یہ تھا کہ مافوق الفطرت واقعات کی چھان بین کی جائے۔ یہ لفظ سوسائٹی کے ایک ممبر مسٹر واٹرس نے وضع کیا جو یونانی زبان کے دو الفاظ کا مرکب ہے جن کا مطلب فاصلہ سے محسوس کرنا ہے۔ یہ الفاظ ان تمام واقعات کا بھی احاطہ کرتے ہیں جو دو اشخاص کے درمیان بغیر کسی میڈیم کے عمل میں آتے ہیں۔

مسٹر واٹرس کی اپنی تشریح یہ تھی کہ ایک ذہن دوسرے ذہن کے حواس خمسہ کو ذریعہ بنائے بغیر اثر ڈال سکتا ہے۔ سوسائٹی نے بعد میں ایک اصطلاح Telepathy (انتقال خیال) اختیار کی۔ عجیب بات یہ ہے کہ Telepathy کو برطانیہ کی حکومت کی سرپرستی حاصل نہ ہو سکی۔

البتہ اشتراکی ممالک میں حکومتی سطح پر تحقیق کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شکل بھی پیش آئی کہ وہ اس کو صرف مادہ کے حوالہ سے ثابت کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی اشتراکی ممالک میں ماورائی علوم پر ریسرچ ہوئی ہے۔ ان علوم میں ماورائی علوم کی ایک شاخ ٹیلی پیتھی بھی ہے۔ ماورائی علوم میں ریسرچ نے اتنی زیادہ کامیابی حاصل کی کہ وہاں ان علوم سے متعلق یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔

جہاں تک سائنسی اعتقادات کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ ہر چیز کا قیام لہروں پر محیط ہے۔ دراصل وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ زندگی لہروں سے مرکب ہے۔ زندگی کا تجربہ یہ بات روشن کرتا ہے کہ دراصل خیالات کے ردوبدل کا دوسرا نام ہے۔ خیالات کا یہ ردوبدل انفرادی طور پر بھی ہوتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔ انفرادی طور پر اس طرح کہ ایک ہی خیال ذہن پر بار بار وارد ہوتا ہے اور کچھ وقفہ کے لئے گم ہو جاتا ہے اور پھر یہ خیال سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً بھوک، پیاس، خوش ہونا یا غمزدہ ہونا، کسی کو پیار کرنے کی خواہش یا یہ تقاضا کہ ہمیں کوئی پیار کرے، گرمی سردی کا احساس، صحت و بیماری کے خیالات جن کا

ردوبدل میں آدمی ساری زندگی بسر کرتا ہے۔ خیالات میں اجتماعی ردوبدل یہ ہے کہ کائنات میں ہر فرد دوسرے تمام افراد سے خواہ وہ کسی بھی دوسرے سیارے میں موجود ہو ہم رشتہ ہے۔

سائنسی نقطہ نظر سے ہٹ کر ان لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے جو مادے (Matter) کو مفروضہ (Fiction) قرار دیتے ہیں تو یہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ مفروضہ حواس سے خود کو آزاد کیا جاسکتا ہے اور یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ مسلمہ حواس کو ذریعہ بنائے بغیر کسی بھی سیارے میں آباد مخلوق کو اپنا پیغام پہنچایا جاسکتا ہے۔ روحانی مکتبہ فکر ان ہی مشاہدات اور تجربات پر کام کر رہا ہے اور ان ہی نظریات کو فروغ دینے کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام اس دنیا میں تشریف لائے اور بالآخر اس پیغام کی تکمیل ہو گئی۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ جب خواب کا تذکرہ آتا ہے تو ہم فرائڈ کو سامنے لے آتے ہیں اور قرآن پاک میں خواب کی اہمیت و حکمت کے بیان کو محض برکت کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں جبکہ اللہ کے ارشاد کے مطابق خوابوں کے ذریعے غیب کا انکشاف ہوتا ہے اور ہم خواب کی حقیقت جان کر زمان و مکان (Time & Space) کی زندگی سے آزاد ہونے کا فارمولا معلوم کر سکتے ہیں۔

روحانیت کا تذکرہ آتا ہے تو ہم سائنسی اصطلاح "Aura" پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کو کوئی نہیں پڑھتا۔ شاہ صاحب نے Aura کو جسم مثالی کے نام سے متعارف کرایا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ Aura (جسم مثالی) کتنے رنگوں سے مرکب ہے اور ہر رنگ ایک زندگی رکھتا ہے اور یہی رنگ خیالات بن کر ہماری زندگی کے تقاضے بن جاتے ہیں۔

جب ہمارے سامنے ٹیلی پیتھی کا لفظ آتا ہے تو ہمارے اوپر حیرت و استعجاب کے دروازے کھل جاتے ہیں اور جب ہم مراقبہ کا تذکرہ کرتے ہیں تو لوگوں کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں حالانکہ مراقبہ ایک ایسا مسلمہ عمل ہے جس میں کامیابی کے بعد انتقال افکار تو معمولی بات ہے آدمی فرشتوں سے ہمکلام ہو جاتا ہے۔

انسانوں کے درمیان ابتدائے آفرینش سے بات کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ آواز کی لہریں جن کے معنی متعین کر لئے جاتے ہیں سننے والوں کو معطل کرتی ہیں۔ یہ طریقہ اس ہی تبادلہ کی نقل ہے جو انا کی لہروں کے درمیان ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ گونگا آدمی اپنے ہونٹوں کی خفیف جنبش سے سب کچھ کہہ دیتا ہے اور سمجھنے کے اہل سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی پہلے طریقہ کا عکس ہے۔ جانور آواز کے بغیر ایک دوسرے کو اپنے حال سے مطلع کر دیتے ہیں، یہاں بھی انا کی لہریں کام کرتی ہیں۔

درخت آپس میں گفتگو کرتے ہیں، یہ گفتگو صرف آمنے سامنے کے درختوں میں ہی نہیں ہوتی بلکہ دور دراز کے ایسے درختوں میں بھی ہوتی ہے جو ہزاروں میل کے فاصلے پر ہوتے ہیں۔ یہی قانون جمادات میں بھی رائج ہے۔ کنکروں، پتھروں، مٹی کے ذرّوں میں من عن اسی طرح تبادلہ خیال ہوتا ہے۔

ٹیلی پیتھی ایک اصطلاح ہے جس کے معانی اور مفہوم وہی ہیں جو ہمارے اسلاف کے مراقبہ کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ کوئی بھی علم استاد کے بغیر نہیں آتا۔ ہر علم کو سیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی استاد طالب علم کو سکھائے۔

دعا گو

عظیمی

۲۷، مئی ۱۹۹۴ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

محترم عظیمی صاحب

السلام علیکم

اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو عقل عطا کی ہے جس کے ذریعے وہ ایجادات کرتا ہے اور صحیح وغلط کی تمیز کر سکتا ہے۔ پھر روحانی ترقی میں عقل کو رکاوٹ کیوں سمجھا جاتا ہے۔ جاننا چاہتا ہوں کہ عقل کے ذریعے لا محدودیت تک رسائی کیوں ممکن نہیں ہے.....

بہت شکریہ

آپ کا روحانی فرزند، عباد

عزیز روحانی فرزند عباس صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بلاشبہ عقل اللہ کی بڑی نعمت ہے لیکن لوگ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ تمام مادی اشیاء کی طرح عقل بھی محدود ہے۔ وہ وہیں تک ان کی راہنمائی کر سکتی ہے جہاں تک اس کی حد ہے۔ مادہ (Matter)، ورائے مادہ کی لا محدودیت کو کیسے پاکستان ہے..... چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں اس عقل نے آدمی کو فکر و عمل کی انتہائی بلندیوں پر پہنچایا وہیں اسے درماندگی اور پریشانیوں کے گہرے گڑھوں میں بھی دھکیلا ہے۔ آج نوع آدم ہلاکت وخونریزی اور خوف و انتشار کے عذاب میں مبتلا ہے۔

بنیادی وجہ یہی ہے آدمی جب تک عقل کو الٰہی ہدایت کے تابع نہیں کرے گا اس کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اللہ کے نیک اور بر گزیدہ بندے ہر دور میں ہدایت الٰہی کی روشنی پھیلاتے رہے مگر نوع آدم کے بیشتر افراد کو ان کی فکر کے اسی تضاد نے حقیقت تک پہنچنے نہیں دیا۔

موجودہ دور کے عظیم روحانی سائنسدان حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں

''انا کے صفت الٰہیہ میں جذب ہونے کی کئی منزلیں ہیں اور پہلی منزل ایمان لانا ہے اور اس ایمان کے بارے میں قرآن کریم نے اپنی ابتدائی آیت میں شرائط بندی کر دی کہ اس عظیم المرتبہ کتاب میں کوئی شک نہیں ہے اور اس میں اللہ سے ڈرنے والوں یعنی ان لوگوں کے لئے جو برائی سے بچنا اور نیکی کے راستے پر چلنے کا رجحان (Aptitude) ہے صرف ان کے لئے اس میں ہدایت ہے اور پھر وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، غیب پر یقین رکھتے ہیں۔

اس حوالہ کے بعد حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں

قانون یہ ہے کہ غیب کی دنیا سے متعارف ہونے کے لئے غیب کی دنیا پر یقین رکھنا ضروری ولازمی ہے۔

اس فرمان کی روشنی میں بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تمام لوگ جو صرف اور صرف عقل کی موشگافیوں پر یقین رکھتے ہیں اور اسی کے ذریعے حیات و کائنات کو سمجھنا اور اس کی گتھیوں کو سلجھانا چاہتے ہیں وہ کس قدر نادانی میں مبتلا ہیں اور کیوں حیات و کائنات کی صداقتوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ عقل صرف ہاں کی نمائندگی کرتی ہے جبکہ زندگی کی حقیقت نفی اور اثبات میں مضمر ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ کائنات کی ساخت میں نظر نہ آنے والی روشنی (نسمہ) ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کی ساخت میں موجود چھوٹے سے چھوٹے کم ترین جز کی بنیاد دو قسموں پر ہے۔ ایک منفی اور ایک مثبت اور دونوں صلاحیتوں میں توازن ہے..... یہ وہ بنیادی شعاعیں ہیں جو کسی بھی وجود کی ابتدا کرتی ہیں۔ یہ روشنیاں ہمارے اطراف خلا میں اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ ان میں کوئی فاصلہ ہے اور نہ ہی وہ ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ یہی وہ لکیریں ہیں جو تمام مادی اجسام کی بناوٹ میں اصل (Base) کا کام دیتی ہیں۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

۱، دسمبر ۱۹۹۴ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

اللہ تعالیٰ آپ کی صحت میں برکت عطا فرمائے۔آمین

میں نفسیات کی طالب علم ہوں اور میری درخواست ہے کہ شعور اور لاشعور کی روحانی حیثیت کے بارے میں وضاحت فرمادیں۔شکریہ

مسز نگینہ چنہ

ابدال حق حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر انسان جزولاتجزیٰ اور فی نفسہ احساس کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کو جب ہم حرکت کا نام دینا چاہیں گے تو نگاہ کہیں گے۔

آدمی دیداست و باقی پوست است

دید آں باشد کہ دید دوست است

شعر میں مولانا رومی نے انسان کا تذکرہ کیا ہے جو وحدت میں احساس کا درجہ رکھتا ہے اور کثرت میں نگاہ ہے۔

مثال..... ہم قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور آئینہ میں اپنا عکس دیکھتے ہیں،اس وقت کہتے ہیں کہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھ رہے ہیں۔ دراصل یہ طرز کلام بالواسطہ ہے، براہ راست نہیں ہے۔جب ہم کسی بات کو براہ راست کہنا چاہیں گے تو کہیں گے کہ آئینہ ہمیں دیکھ رہا ہے یا ہم اس چیز کو دیکھ رہے ہیں جس چیز کو آئینہ دیکھ رہا ہے یعنی ہم آئینہ کے دیکھنے کو دیکھ رہے ہیں۔یہ ہوا براہ راست طرز کلام۔اس کی تشریح یہ ہے کہ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں، پہلے ہمارے ذہن میں اس کا تصور ہوتا ہے۔دوسرے درجہ میں شے کو آنکھ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اگر اس کے بارے میں کبھی کوئی خیال نہیں کیا ہے یا نہیں سوچا یا ہمیں اس چیز کا علم حاصل نہ ہو تو ہم اس چیز کو نہیں دیکھ سکتے۔کسی شخص کا فالج زدہ ہاتھ خشک ہو گیا ہے، نشتر چبھو کر اس سے سوال کرتے ہیں کہ بتاؤ تمہارے ہاتھ کے ساتھ کیا ہوا ہے تو وہ جواب دیتا ہے مجھے معلوم نہیں۔اس نے نفی میں جواب کیوں دیا..... اس لئے کہ نشتر کی چبھن اس نے محسوس نہیں کی یعنی نشتر چبھونے کا علم نہیں ہوا جو احساس کا پہلا درجہ ہے۔وہ اس حالت میں نشتر چبھونے کا عمل دیکھ سکتا تھا کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتیں، یہاں نگاہ ذہن کو نشتر چبھونے کا علم دے سکتی تھی۔چنانچہ ہر حال میں یہی علم نگاہ کا پہلا درجہ ہے۔پھر وہ اس چیز کو دیکھتا ہے، یہ احساس کا دوسرا درجہ ہے۔پھر سنتا ہے، یہ احساس کا تیسرا درجہ ہے۔پھر شے سونگھتا ہے، یہ احساس کا چوتھا درجہ ہے۔پھر وہ اس چیز کو چھوتا ہے، یہ احساس کا پانچواں درجہ ہے۔فی الواقع احساس کا صحیح نام ''نگاہ'' ہے..... احساس کے پانچ درجات ہیں۔

O پہلے درجہ میں اس کا نام خیال ہے

O دوسرے درجہ میں اس کا نام نگاہ ہے

O تیسرے درجہ میں اس کا نام سماعت ہے

O چوتھے درجہ میں اس کا نام شامہ ہے..... اور

O پانچویں درجہ میں اس کا نام لمس ہے

ہر درجہ کی اضافی شکل ہے۔ خیال اپنے درجہ میں ابتدائی علم ہے، نگاہ اپنے درجہ میں اضافی علم ہے۔ سماعت اپنے درجہ میں تفصیلی علم ہے اور شامہ اپنے درجہ میں توسیعی علم ہے..... آخر میں لمس اپنے درجہ میں محسوساتی علم بن گیا۔ اولیت صرف علم کو حاصل ہے جو دراصل نگاہ ہے..... ہر حس اسی کی درجہ بندی ہے۔

نگاہ کا مفہوم واضح ہو چکا ہے اب اس کے زاویئے اور حقیقت کی طرف آیئے..... نگاہ دو طرح دیکھتی ہے، ایک براہ راست دوسرا بالواسطہ۔ آئینہ کی مثال اوپر آچکی ہے۔ جب ہم اپنی ذات Inner یعنی داخل میں دیکھتے ہیں یہ نگاہ کا براہ راست دیکھنا ہے۔ یہی دیکھنا وحدت میں دیکھنا ہے۔ وحدت میں دیکھنے والی یہی نگاہ انسان، امر ربی، روح یا جزو لاتجزیٰ ہے۔ یہی نگاہ شاہد کو مشہود کے قریب کرتی ہے۔ یہی نگاہ اپنی جگہ علم الٰہی یا علم توحید ہے۔ یہی نگاہ کثرت میں اضافی، تفصیلی، توسیعی اور محسوساتی طبیعت بنتی ہے۔ اسی نگاہ کی دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں حرکت، کثرت کا علم ہے۔

یہی نگاہ جب بالواسطہ دیکھتی ہے تو مکانیت اور زمانیت کی تعمیر کرتی ہے۔ اس کی حرکات میں جیسے جیسے تبدیلی ہوتی ہے، اسی مناسبت سے کثرت کے درجات تخلیق ہوتے ہیں۔ یہ نگاہ حرکت میں آنے سے پہلے ابتدائی مرحلہ میں علم اور علیم اور حرکت میں آنے کے بعد دوسرے مرحلہ میں شعور اور لاشعور، تیسرے میں نگاہ اور تشکیل، چوتھے میں گفتار اور سماعت، پانچویں میں رنگینی اور احساس، چھٹے میں کشش اور لمس بن جاتی ہے۔

دعا گو

عظیمی

مئی ۱۹۹۵ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

ڈاکٹر شگفتہ فیروز صاحبہ

انسانی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانی زندگی میں کسی نہ کسی عقیدے کا ہونا لازمی ہے۔اس کے بغیر انسانی زندگی نامکمل اور ادھوری رہ جاتی ہے۔ جس طرح اللہ کے اوپر یقین رکھنا،اللہ کو حاضر و ناظر جاننا ایک عقیدہ ہے،اسی طرح اللہ کا انکار اور کفران بھی عقیدے کے دائرے میں آتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اس کا نام بدعقیدگی یا کفر ہے۔یوں سمجھئے کہ ایسا آدمی اللہ کا کفران کرنے کے عقیدے پر قائم ہے۔

زندگی میں جب عقیدہ زیر بحث آتا ہے تو یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ اس عقیدے پر قائم رہنے کے لئے کچھ قواعد و ضوابط مرتب کئے جائیں۔

قرآن پاک میں تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ اس بات کی دعوت اور ترغیب دیتا ہے کہ بندہ اس عقیدہ توحید پر قائم رہے۔عقیدہ توحید کی دعوت اور ترغیب انبیاء کرام کے ذریعہ لوگوں تک پہنچادی گئی ہے۔

اللہ چاہتے ہیں کہ انسان اس عقیدہ پر قائم رہے کہ پرستش اور عبادت کے لائق اللہ کے سوا اور کوئی ہستی نہیں ہے۔تمام انبیاء کرام نے اسی طرز فکر کو بالذات قائم رکھنے کے لئے..... زندگی گزارنے کے اصول و قواعد مرتب کئے ہیں۔

اگر حقیقت کی نظروں سے دیکھا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر عمل اور ہر حرکت میں بندہ اللہ کا محتاج ہے۔پیدائش کے بعد سے بچپن،لڑکپن اور جوانی کا زمانہ ہو یا انحطاط کے بعد دوسرے عالم کی زندگی ہو،انسان بہر حال اللہ کا محتاج ہے۔

مخلوق کی تعریف یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ،ہر آن ذی احتیاج ہے اور خالق کی تعریف یہ ہے کہ وہ بے نیاز اور ہر قسم کی احتیاج سے ماورا ہے۔زندگی کے معاملات پر غور کرنے سے مشاہدہ ہوتا ہے کہ خالق نے مخلوق کے لئے ہر چیز مفت فراہم کی ہے۔زمین،آکسیجن،بارش ہر چیز مفت مہیا کی ہے۔پوری تاریخ انسانی میں ایک فرد یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے زمین کا،پانی کا،ہوا کا کوئی ٹیکس دیا ہے۔

دعا گو

عظیمی

مئی ۱۹۹۵ء

مرکزی مراقبہ ہال،کراچی

بہت عزیز، پیارے دوست، محترم رفیق، روحانی فرزند، انعام عظیمی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ کا خط محبت عقیدت سے لبریز، حسن ذوق سے معمور، عاجزی کا مظہر اور خود سپردگی کا نقش بن کر موصول ہوا۔ آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں آپ سے دلی تعلق رکھتا ہوں۔ یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے، میں آپ کو اپنا معاون، اپنا ہمدرد اور سلسلہ عظیمیہ کا ممتاز فرد تصور کرتا ہوں۔

قریشی صاحب مرحوم کے بعد بہت زیادہ تنہا ہو گیا تھا۔ آپ نے بے پناہ عقیدت اور ایثار سے، تنہا ہونے سے بچالیا..... اور مجھے حوصلہ دیا۔ ایک رفیق سفر کی جدائی کو میں برداشت کر گیا..... اللہ آپ کو جزاء عطا فرمائیں..... آمین

اتنے عظیم دوست، ایثار پیشہ ساتھی سے کوئی کس طرح ناراض ہو سکتا ہے۔ پریشانیاں اور راحتیں دو لازم و ملزوم کردار ہیں۔ نیا میں ہر شخص کو ان سے بہر حال گزرنا پڑتا ہے۔ البتہ عدم توازن سے انسان گھبرا جاتا ہے لیکن اس کے پس پردہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ جانتا ہے یا وہ لوگ جانتے ہیں جنہیں اللہ بتا دیتا ہے۔ ہمہ وقت میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ آرام کریں۔ اس آرام میں آپ مجھ سے اور سلسلہ والوں سے ہمیشہ تعاون پائیں گے۔ آپ یقین رکھیں، میں آپ سے خوش ہوں۔ آپ نے میری قابل قدر حد تک خدمت کی ہے۔ اس کا اجر اللہ آپ کو یہاں اور وہاں دونوں جگہ عطا فرمائیں.....آمین۔

حکیم نور عجم عظیمی سلام عرض کرتے ہیں اور دعا کی درخواست کرتے ہیں کہ اللہ ان کے کاروبار میں برکت دیں اور ان کا مطب مرجع خلائق ہو جائے۔

حنا بیٹی سے ہر ہفتہ ملاقات ہو جاتی ہے۔ جمعرات کی شام اپنے شوہر کے ساتھ آجاتی ہے اور جمعہ کی شب کو واپس گجرانوالہ چلی جاتی ہے۔ ماشاءاللہ اس کا بچہ اچھا ہے، سب گجرانوالہ کا پہلوان کہتے ہیں۔

یہ حقیر حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی طرز فکر سے قرآن کا مفہوم لکھنا چاہتا ہے..... دعا کریں کہ اللہ روشنی عطا کرے..... میں ہیچ مدان، اللہ کے بھروسہ پر مرتبہ احسان کے مراقبہ کے بعد بیٹھ جاتا ہوں اور جو ذہن میں آتا ہے میاں صاحب لکھ لیتے ہیں۔ میاں صاحب روزانہ صبح ساڑھے ۴ بجے آجاتے ہیں اور ۶ بجے تک قرآن کریم کی روحانی تشریح لکھتے ہیں۔ بسم اللہ شریف، الحمد شریف اور سورہ بقرۃ کے ڈھائی رکوع اب تک لکھ چکے ہیں۔

بیگم صاحبہ اور بچوں کو دعا پیار۔ صاحبزادہ صاحب کو دعائیں پہنچادیں۔ انشاءاللہ جون کے پہلے ہفتہ کراچی میں ملاقات ہو گی۔ سب دوستوں کو سلام عرض کر دیں۔ اور کیا لکھوں، راضی بہ رضا ہوں اور اللہ کے فضل و کرم سے خوش ہوں۔

دعا گو

عظیمی

۲۶، مئی ۱۹۹۵ء

لاہور

جناب الشیخ عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاۃ

آپ کی تحریروں میں ٹائم اسپیس کا تذکرہ عام ملتا ہے اس سے متعلق ایک اور اہم موضوع براہ راست اور بالواسطہ طرز مشاہدہ بھی ہے۔اپنی کم مائیگی پر افسوس ہوتا ہے کہ میں آج تک اس مسئلے کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں پایا۔

آپ سے درخواست ہے کہ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت نکال کر اس اہم موضوع کی وضاحت فرمادیں۔

ارسلان (روس)

اللہ اور اللہ والوں سے محبت کی روشنی سے معمور برخوردار ارسلان

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

ہم جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم باہر دیکھ رہے ہیں، حالانکہ ہم کسی چیز کو اس وقت دیکھ سکتے ہیں جب اس چیز کا عکس ہمارے ذہن کی سطح پر نمودار ہو جائے۔ہم کرسی کو کرسی اس وقت کہتے ہیں جب کرسی کا علم، کرسی کا عکس کی صورت میں ہمارے دماغ پر منعکس ہوتا ہے۔اگر کرسی ہمارے سامنے نہیں ہے تو ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ہم کسی چیز کے تذکرے سے قاصر رہیں گے جب تک کہ وہ چیز ہمارے سامنے نہ ہو اور ہمارا ذہن اس سے باخبر نہ ہو۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ اپنے دماغ کی سطح پر دیکھتے ہیں یا اپنے اندر دیکھتے ہیں۔پھر یہ کہنا کہ ہم باہر دیکھ رہے ہیں مفروضہ کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور یہ مفروضہ ہمیں جبلی طور پر ہمارے اسلاف سے منتقل ہوا ہے۔

ابھی بچہ شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم نہیں رکھتا کہ اس کے اطراف کا عالم اسے مسلسل اور متواتر یہ اطلاع قبول کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ جو کچھ نظر آرہا ہے، وہ ہم خارج میں دیکھ رہے ہیں۔بچہ کو جب چاند سے روشناس کرایا جاتا ہے تو یہ بات کہی جاتی ہے کہ چندا ماموں آسمان پر ہیں۔ساتھ ہی ماں یا خاندان کا کوئی فرد انگلی کے اشارے سے یہ بات بچے کو ذہن نشین کرا دیتا ہے کہ چاند ہم سے دور اور بہت دور نظر آتا ہے۔

جب ہم دوری کا تذکرہ کرتے ہیں تو فاصلہ اور وقت کا علم وجود میں آجاتا ہے اور Time and Space کا یہ علم ہماری زندگی کے ہر ذرے میں پیوست اور نقش ہو جاتا ہے، اب ہم وقت کے بغیر کسی چیز کا تذکرہ کر ہی نہیں سکتے۔جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بچہ ہے تو فی الواقع یہ کہتے ہیں کہ یہ بچہ اتنی مدت گزار چکا ہے۔جوانی کے تذکرہ میں بھی یہ بات پوشیدہ ہے کہ بچہ سولہ یا اٹھارہ سالوں کا وقفہ پھلانگ چکا ہے اسی طرح ادھیڑ عمر کا ذکر بھی اس بات کی

نشاندہی کرتا ہے کہ یہ شخص تیس، چالیس سالوں گزرے ہوئے وقفہ کا تمثال ہے۔یہی صورت بڑھاپے کی ہے..... ہم آم کے درخت کا تذکرہ اس کے وقت گزارنے کے عمل کے بغیر نہیں کر سکتے۔ جس وقت آم کے درخت کو آم کہا جاتا ہے تو پہلے ہمارا ذہن اس درخت کے ساتھ چپکے ہوئے وقت کو ناپتا ہے۔

جب ہم کسی درخت کے بیج کا ذکر کرتے ہیں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہوتی ہے کہ یہ بیج کسی وقت زمین میں بویا گیا تھا..... پھر اس کا درخت بنا پھر اس درخت نے نشوونما میں ایک زمانہ گزارا اور پھر اس درخت سے بیج کا ظہور ہوا۔یعنی ایک بیج کو دیکھنے یا بیان کرنے کے لئے ہمیں کم و بیش مہینوں اور بعض اوقات برسوں وقت سے گزرنا پڑتا ہے۔بغیر وقت کے محیط ہونے کے ہم کسی بھی حالت میں بیج کو بیج نہیں کہہ سکتے۔ علیٰ ہذاالقیاس یہ حال کائنات میں موجود ہر شے کے اوپر محیط اور مسلط ہے۔

ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں، جو کچھ سمجھ ہے یا جس چیز کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کی حیثیت صرف اطلاع کی ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اطلاع ہمیں کہاں سے وصول ہوتی ہے اور اس اطلاع کا ذریعہ (Source) کیا ہے..... کوئی بھی اطلاع یا کسی شے کا علم ہمیں لازمانیت سے وصول ہوتا ہے اور یہی لازمانیت نت نئی اطلاعات زمانیت (Time) کے اندر ارسال کرتی رہتی ہے۔لازمانیت کائنات (موجودات) کی بنیاد (Base) ہے۔اگر ہم لازمانیت کو ایک نقطہ سے تشبیہ دیں تو اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اس نقطہ میں کائنات کی یکجائی کا پروگرام نقش ہے۔

لہروں کے ذریعے اس نقطہ سے جب کائنات کا یہ یکجائی کا پروگرام نشر ہوتا ہے تو انسان کے حافظہ کی سطح سے آکر ٹکراتا اور بکھرتا ہے۔بکھرتے ہی ہر لہر مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہنسی بولتی، چلتی پھرتی، گاتی بجاتی تصویر بن جاتی ہے لیکن چونکہ جبلی طور پر انسان کا حافظہ محدود ہے اس لئے یہ حافظہ یا وقت، ایک دائرہ کے اندر محدود ہونے کی وجہ سے تصویر کے مابین فاصلہ بن جاتا ہے۔یہی فاصلہ ہمیں کسی چیز کو خود سے دور دکھاتا ہے لیکن ہمارا یہ دیکھنا حقیقت کے خلاف اور مفروضہ ہے۔اگر ہم اس (Base) یا نقطہ کو تلاش کر لیں جہاں کائنات کا یکجائی پروگرام منقوش ہے تو فاصلہ کالعدم ہو جاتا ہے۔

لازمانیت سے آئی ہوئی ہر اطلاع وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر ہے۔اس لئے ہر وہ ذرہ جو زمین پر موجود ہے ارتقاء کے ساتھ ساتھ انحطاط کے ساتھ بھی وابستہ ہے۔انحطاط کا مطلب یہ ہے کہ ذرہ جہاں سے آیا تھا۔وہاں جانے کے لئے بے قرار رہتے ہوئے خود کو وقت کے دائرے سے آہستہ آہستہ دور کر رہا ہے اور اپنے مخزن کی طرف لوٹ رہا ہے جیسے جیسے زمانیت سے بعد واقع ہوتا ہے اسی مناسبت سے لازمانیت کے دائرہ سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔

مثال: ٹرانزسٹر یا ریڈیو جن ذرات سے مرکب ہے ان کو بھی وقت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹرانزسٹر میں کام کرنے والے ذرات وقت کے دائرہ سے اتنے دور ہو گئے ہیں کہ لازمانیت کی تحریکات قبول کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہو گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ریڈیو کا ذرہ ہزاروں میل دور کی آواز سن لیتا ہے اور سن کر نشر کر دیتا ہے۔یہ بات غور طلب ہے کہ ٹرانزسٹر کے ان ذرات کو اس مقام تک پہنچانے میں انسان نے اپنی لازمانی صلاحیتوں کو استعمال کیا ہے اور اس کا ثمرہ یہ ہے آج دنیائے مواصلات میں ضخیم پردے حائل نہیں ہیں۔

جب انسان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ذرات سے کام لے سکتا ہے تو پھر یہ کیوں کر ممکن نہیں کہ وہ ذرات سے کام لینے والی صلاحیتوں کو اپنے حق میں استعمال کر کے براہ راست مستفید ہو لیکن نوع انسانی کی تاریخ شاہد ہے کہ انسان نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔

یہ بات ہر فرد کے علم میں ہے کہ انسان پیدائش کے وقت جو شعور رکھتا ہے وہ بالغ شعور سے الگ اور مختلف ہوتا ہے۔ رضاعی دور میں بچے کے اوپر بیداری سے زیادہ نیند کا غلبہ رہتا ہے اور بچہ نیند کی حالت میں کبھی ہنستا ہے اور کبھی منہ بنا کر اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ کوئی چیز ایسی دیکھ رہا ہے جو اس کے لئے ناگوار ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن پر وہ نقوش منتقل ہوتے رہتے وہیں جو اس کے ماحول میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچہ وہی زبان سیکھتا ہے جو اس کے ماحول میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

زبان کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں یہ بات بھی منتقل ہوتی رہتی ہے کہ آواز کے سننے میں قرب و بعد کا تعلق ہے۔ قریب سنانے کے لئے آواز آہستہ بولی جاتی ہے اور دور سنانے کے لئے آواز اونچی بولی جاتی ہے۔

دوری اور قرب کا یہ طریقہ کار کسی بچے کے اندر وقت کی پابندی پیدا کر دیتا ہے اور یہ طریقہ وقت کو اتنا پھیلا دیتا ہے کہ انسان کی ہر حس اور صلاحیت اس کے اندر مقید ہو جاتی ہے اور جیسے جیسے بچہ اس مقید زندگی میں وقت گزارتا ہے اسی مناسبت سے وہ لازمانیت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

نوع انسانی میں باشعور اور باصلاحیت افراد اپنی صلاحیتوں کو بالواسطہ کار آمد بنانے کی بجائے براہ راست استعمال کریں تو پوری نوع زمانیت کی گرفت سے آزاد ہو کر لازمانی صلاحیتوں سے آشنا ہو جائے گی۔ اب نوع انسانی اس مرحلے پر پہنچ گئی ہے کہ وہ اللہ کے اس قانون سے فیض یافتہ ہو کر اپنے اوپر سے مقید، مضطرب اور مغموم زندگی کا چولا اتار پھینک دے۔

دعا گو

عظیمی

۲۶، مئی ۱۹۹۵ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

یقین ہے آپ خیریت سے ہیں۔اللہ تعالیٰ آپ کی صحت میں برکت عطافرمائے،آمین

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں میں مہر لگادی،ان کی آنکھوں پر گھٹاٹوپ اندھیرا ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔(البقرہ:۷)

دلوں اور کانوں پر مہر لگانے سے کیا مراد ہے۔توجیہ بیان فرمادیجئے۔

شکریہ

سید طاہر جلیل

عزیزالقدر سید طاہر جلیل صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

جب کوئی آدمی، جس کے سامنے روشن راستہ ہے، باوجود اس کے،اس کو روشن راستہ پر چلنے کی ترغیب دی جارہی ہے اور اس راستہ پر انعامات واکرامات کی بارش برس رہی ہے،اس کی اطلاع بھی اس کو دی جارہی ہے لیکن وہ روشن راستہ کو قبول نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کا تاریک راستہ پر چلنا اس لئے قبول کرلیتے ہیں کہ وہ شیطان کی طرح نافرمانی اور بغاوت پر آمادہ ہے لہٰذا اس کے اوپر روشن راستہ کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔

اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر لگادی۔ان کی آنکھوں پر گھٹاٹوپ اندھیرا ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اللہ کے فرمان کے مطابق دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی نے ازخود وہ راستہ اختیار کرلیا جس راستہ پر چل کر آدمی عقل سلیم سے بے بہرہ ہوجاتا ہے، سماعت سے محروم ہوجاتا ہے اور بینائی پس پردہ چلی جاتی ہے۔اللہ اسے اس بات سے منع نہیں کرتے کیونکہ اللہ اس کا عمل بقول کرلیتے ہیں۔چنانچہ وہ روشن راستہ پر گامزن نہیں ہوسکتا۔

روحانیت سے تعلق رکھنے والے حضرات کم وبیش اس بات سے واقف ہیں کہ مخلوق کے اندر ایسے نقطے موجود ہیں جن نقطوں میں زندگی میں کام آنے والی روشنی ذخیرہ ہوتی رہتی ہے۔تصوف اور روحانیت سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان نقطوں کو چھ لطیفوں سے تعبیر کرتے ہیں۔روحانیت میں ان کا

اصطلاحی نام لطائف ستہ ہے یعنی ایک آدم زاد انفرادی طور پر یا اجتماعی اعتبار سے چھ نقطوں کے اندر سفر کرتا ہے۔ان چھ نقطوں کو قرآن پاک کے قانون کے مطابق تین دائروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا۔پہلا دائرہ جس کے اندر دو نقطے موجود ہیں آدمی کے اوپر دو راہیں کھولتا ہے۔ایک راستہ شیطنیت ہے اور دوسرا رحمت ہے۔

۲۔دوسرا دائرہ رحمت کی طرف سفر کرنے کا ذریعہ ہے۔

۳۔تیسرا دائرہ منزل ہے یعنی اس دائرے میں بندے کو اللہ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

تینوں دائرے ہمہ وقت چار نورانی نہروں سے فیڈ ہوتے ہیں۔دائرے تین ہیں،نہریں چار ہیں۔ان چار نہروں میں سے ایک نہر تیسرے دائرہ کو جس میں شیطنت اور رحمت کے راستے متعین ہیں سیراب کرتی ہے۔اگر آدمی باوجود ترغیب کے ضد اور نافرمانی کا مرتکب ہو کر صراط مستقیم سے ہٹ کر تاریکی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو تیسرے دائرہ کا پہلا نقطہ زہریلا ہو جاتا ہے اور یہ زہر اس کو متعفن پھوڑا بنا دیتا ہے۔اس نقطہ کے اندر سڑاند اور بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔اوپر کے دو دائرے اسے زندہ رکھنے کے لئے فیڈ تو کرتے ہیں لیکن ان کا ذہنی رابطہ یا ہمدردی تیسرے نقطہ کے ساتھ نہیں رہتی۔اوپر کے دائرے سراپا نور اور روشنی ہیں،لطافت اور خوشبو ہیں،اس لئے یہ متعفن پھوڑا یا نقطہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔جب متوجہ نہیں ہوتا تو وہ راستہ بھی نظر نہیں آتا جس راستہ پر چل کر آدمی آسمانوں کی سیر کرتا ہے،فرشتوں سے ملاقات کرتا ہے اور اللہ کا عرفان حاصل کرتا ہے۔وہ نقطہ جس کو ہم نے متعفن پھوڑے کا نام دیا ہے لطیفۂ نفسی ہے۔عرف عام میں اس کو نفس کہا جاتا ہے۔

شعوری زندگی کی ہر حرکت،ہر عمل،ہر تصور،ہر خیال،ہر ادراک اور احساس دو رخوں پر کام کرتا ہے۔ایک وہ رخ ہے جس کا تعلق شیطنت سے ہے اور ایک وہ رخ ہے جس کا تعلق رحمانیت سے ہے۔اسی طرح نفس کا تعلق بھی دو طرزوں میں ہمہ وقت قائم رہتا ہے،ایک طرز شیطنت ہے اور دوسری طرز وہ حکمت ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ قرآن پاک کی صورت میں نوع انسانی کو عطا ہوئی ہے۔جس آدمی کے نزدیک زندگی صرف دنیا یا دنیا کا عیش و نشاط ہے،خود نمائی ہے،علم کا زعم ہے..... وہ اپنے خالق سے دور ہو جاتا ہے۔قلب یا ضمیر اسے برابر اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ جو راستہ اختیار کیا گیا ہے یہ ان لوگوں کا راستہ نہیں ہے جو انعام یافتہ ہیں لیکن بندہ ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس راستہ کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا۔

دین میں جبر نہیں ہے اور ہر آدمی کو اختیار دیا گیا ہے کہ صحیح یا غلط میں سے ایک راستہ کا انتخاب کرے۔مسلسل ترغیب(Inspiration)اور خیر کی آواز کو نظر انداز کرنے کے بعد جب یہ معاملہ اللہ کے حضور پیش کیا جاتا ہے تو اللہ اس کے ارادہ اور اختیار کو قبول کر لیتے ہیں۔ایسے لوگوں کے لئے اب صراط مستقیم پر چلنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر لگا دی۔ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اللہ نے دلوں پر مہر اس لئے لگائی ہے کہ وہ مثبت راستہ پر چلنا ہی نہیں چاہتا اس لئے اللہ نے آدمی کے ارادہ اور اختیار کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آدم اور جنات بااختیار ہیں اور انہیں نیکی یا بدی اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔ اللہ اگر چاہیں تو دنیا میں چوری نہیں ہو سکتی اور اگر اللہ چاہیں تو دنیا میں کوئی قتل نہیں ہو سکتا، کوئی آدمی بے نمازی نہیں ہو سکتا۔ اگر اللہ چاہیں تو شیطان کا وجود ختم ہو سکتا ہے لیکن اس طرح انسان کے بااختیار ہونے کا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔

حنا اور بچوں کو دعائیں۔ سلسلہ کے تمام احباب کو سلام و دعا۔ محفل مراقبہ میں سب دوستوں کو سلام عرض کر دیں۔

دعا گو

عظیمی

۱۶، جولائی ۱۹۹۵ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

حضرت عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

نظریہ رنگ ونور کی تھیوری یہ ہے کہ زندگی کی بنیاد روشنیوں پر قائم ہے۔مادی جسم ان روشنیوں کے تنزل سے وجود میں آتا ہے۔اس سلسلہ میں آپ نے لفظ ''نسمہ'' استعمال کیا ہے۔آپ سے التماس ہے کہ نسمہ کی ماہیت اور اس کے اعمال پر تفصیل سے روشنی ڈالئے۔

ڈاکٹر ناہید،ایم۔بی۔بی۔ایس

دعا گو

عظیمی

مئی ۱۹۹۷ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

ڈاکٹر ناہید صاحبہ

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

کائنات کی ساخت میں بساط اول وہ روشنی ہے جس کو قرآن پاک میں ماء (پانی) کے نام سے یاد کیا ہے۔ موجودہ دور کی سائنس میں اسے گیسوں کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نسمہ کا انہی صدہا گیسوں کے اجتماع سے اولاً جو مرکب بنا ہے اس کو پارہ یا پارہ کی مختلف شکلیں بطور مظہر پیش کرتی ہیں۔ ان ہی مرکبات کی بہت سی ترکیبوں سے مادی اجسام کی ساخت عمل میں آتی ہے اور ان ہی اجسام کو موالید ثلاثہ یعنی حیوانات، نبادات اور جمادات کہتے ہیں۔ تصوف کی زبان میں ان گیسوں میں سے ہر گیس کی ابتدائی شکل کا نام نسمہ ہے۔

دوسرے الفاظ میں نسمہ حرکت کی ان بنیادی شعاعوں کے مجموعے کا نام ہے جو وجود کی ابتدا کرتی ہیں۔ حرکت..... اس جگہ ان لکیروں کو کہا گیا ہے جو خلا میں اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ وہ نہ تو ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہیں اور نہ ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔

یہی لکیریں مادی جسم میں آپ کا واسطہ ہیں۔ ان لکیروں کو صرف روح کی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ کوئی بھی مادی خوردبین اس کو کسی شکل و صورت میں نہیں دیکھ سکتی البتہ لکیروں کے اثرات کو مادیت یا مظہر کی صورت میں پا سکتی ہے۔

جب اسکولوں میں لڑکوں کو ڈرائنگ سکھائی جاتی ہے تو ایک کاغذ جس کو گراف پیپر کہتے ہیں ڈرائنگ کی اصل میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کاغذ پر چھوٹے چھوٹے چوکور خانے ہوتے ہیں۔ ان چوکور خانوں کو بنیاد قرار دے کر استاد یہ بتاتے ہیں کہ ان چھوٹے چھوٹے خانوں کی اتنی تعداد سے آدمی کا سر، اتنی تعداد سے ناک اور اتنی تعداد سے گردن بنتی ہے۔ ان خانوں کی پیمائش سے وہ مختلف اعضاء کی ساخت کا تناسب قائم کرتے ہیں جس سے لڑکوں کو تصویر بنانے میں آسانی ہوتی ہے۔ گویا یہ گراف تصویروں کی اصل ہے یا دوسرے الفاظ میں اس گراف کو ترتیب دینے سے تصویریں بن جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح نسمہ کی یہ لکیریں تمام مادی اجسام کی ساخت میں اصل کا کام دیتی ہیں ان ہی لکیروں کی ضرب، تقسیم سے نباتات، جمادات اور حیوانات کی تخلیق ہوتی ہے۔

تخلیقی قانون کی رو سے دراصل یہ لکیریں بے رنگ شعاعیں چھوٹی بڑی حرکات ہیں۔ اتنی ہی اور اس ہی طرز کی ٹھوس حسیات ترتیب پاتی جائیں گی، ان ہی کی اجتماعیت سے رنگ اور کشش کی طرزیں قیام پاتی ہیں اور ان ہی لکیروں کی حرکات اور گردشیں وقفہ پیدا کرتی ہیں۔ ایک طرف ان لکیروں کی اجتماعیت، مکانیت بناتی ہیں اور دوسری طرف ان لکیروں کی گردش، زمانیت کو تخلیق کرتی ہے۔

تخلیقی قانون میں نسمہ کی وہ شباہت جس کو مادی آنکھ نہیں دیکھ سکتی تمثیل کہلاتی ہے اور نسمہ کی وہ شکل و صورت جس کو مادی آنکھ دیکھ سکتی ہے تشخص یا جسم کہلاتی ہے۔

جس طرح تمثیل میں بھی ابعاد (Dimensions) ہوتے ہیں اور روحانی آنکھ ان ابعاد کے طول و عرض کا مشاہدہ ہی نہیں بلکہ ان کی مکانیت کو محسوس کرتی ہے۔ ماہرین روحانیات اسی تمثیل کو ہیولا کہتے ہیں۔ چیز کی موجودگی پہلے ایک تمثیل یا ہیولا کی شکل و صورت میں ہوتی ہے۔ اس کو نسمہ مفرد کہتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے میں یہ نسمہ مفرد جب نسمہ مرکب کی شکل اختیار کر کے مادی جسم بنتا ہے تو حرکت میں انتہائی سستی اور جمود پیدا ہو جاتا ہے اور انسان مکانیت میں خود کو قید اور بند محسوس کرتا ہے اور جب نسمہ مرکب کی ہیت نسمہ مفرد میں تبدیل ہوتی ہے تو انسان کے اوپر سے زماں و مکاں کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے۔ مادی جسم جن روشنیوں پر قائم اور متحرک ہے اس کو روحانیت میں نسمہ اور سائنس میں اورا (Aura) کہا جاتا ہے۔

دعا گو

عظیمی

۱۷، اگست ۱۹۹۵ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

محترم و مکرم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ ..... خدوخال کس طرح وجود میں آتے ہیں..... ان کی تشکیل میں روشنی اور خلا کا کیا کردار ہے اور اطلاع میں پنہاں تصویریں زمین پر کس طرح مظہر بن رہی ہیں۔ مثالوں سے وضاحت فرمادیں تو بات کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

نیاز مند

مقصود احمد

مقصود احمد صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

جس کائنات کو مادی آنکھ دیکھتی ہے اور پہچانتی ہے اس کی بنیاد روشنی ہے۔ ایسی روشنی جس کے اندر بہاؤ ہے۔ موجودہ دور کی سائنس اس کو Gases نام سے جانتی ہے۔ روشنیوں کے بہاؤ سے مراد یہ ہے کہ صدہا Gases کے اجتماع سے شکلیں وجود میں آتی رہتی ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے، ایک گلاس پانی بھر کر دیوار پر زور سے پھینکا جائے۔ پانی بہنے کے بعد جب دیوار پر پوری طرح پھیل جائے تو غور سے دیکھنے سے دیوار کے اوپر مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ جس طرح پانی دیوار کے اوپر مختلف شبیہیں بنالیتا ہے۔ اس طرح نزول کرنے والی روشنیوں کا بہاؤ جب زمین جو کہ کائنات کی ایک اسکرین ہے، پر نزول کرتا ہے تو روشنیاں پھیلنے اور بکھرنے سے افراد کائنات کی شکلیں بن جاتی ہیں۔

بہاؤ کا زمین کی اسکرین سے ٹکرانے کے بعد شبیہ کے اندر جو بنیادی مسالا بنتا ہے وہ مرکری (Mercury) ہوتا ہے۔ روشنیوں کے بہاؤ کے بعد پارے کی روشنیوں سے مل کر اور ایک دوسرے کے اندر جذب ہو کر اجسام بنتے ہیں۔ انہی اجسام کو حیوانات، نباتات اور جمادات کہا جاتا ہے۔

گیسوں میں جو ابتدائی گیس نکلتی ہے اس گیس کی ابتدائی شکل کا نام جسم مثالی ہے۔ جسم مثالی ان بنیادی لہروں یا ان بنیادی شعاعوں کا نام ہے جو وجود کی ابتدا کرتی ہیں۔ نزول کرنے والی لہروں کو لکیروں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

اس بات کو ہم مثال سے واضح کر سکتے ہیں۔ جس آدمی نے بھی سینما میں فلم دیکھی ہے وہ جانتا ہے کہ پروجیکٹر سے مخصوص روشن دان کے ذریعے لہروں کا بہاؤ ہوتا ہے۔ روشنیوں اور لہروں کا یہ بہاؤ اسکرین پر نزول کرتا ہے اور اسکرین سے ٹکرا کر مختلف شکلوں اور صورتوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جب ہم گردن اٹھا کر پروجیکٹر سے نکلنے والی فلمی روشنیوں یا شعاعوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں مسلسل اور متواتر چلتی ہوئی لہروں یا لکیروں کا احساس ہوتا ہے۔ یہ لکیریں نہ ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوتی ہیں اور نہ ایک دوسرے میں پیوست ہوتی ہیں۔ ہر لکیر اپنی جگہ تصویر کا کوئی نہ کوئی خدوخال ہے۔ جس طرح پروجیکٹر سے نکلنے والی روشنیاں اسکرین سے ٹکرا کر تصویریں بنتی ہیں اسی طرح خلا میں سے گزر کر لہریں یا لطیف لہریں مادی اجسام بنتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماورائی لکیریں مادی اجسام میں ایک بنیادی واسطہ ہیں۔ پروجیکٹر سے نکلنے والی شعاعوں کو مادی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ ماورائی لکیروں کو صرف شہود کی وہ آنکھ دیکھ سکتی ہے جو روح کی نگاہ ہے۔ ایسی کوئی ایجاد ابھی تک وجود میں نہیں آئی کہ جس کے ذریعے ماورائی لکیروں کو دیکھا جاسکے البتہ ان لکیروں کے تاثرات کو سائنسی ایجادات کے ذریعے مادیت کے مظہر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

آج کل ماورائی لہروں پر بہت تحقیق ہو رہی ہے۔ ماورائی لہروں کے عکس (Shadow) کو کیمرے کے ذریعے دیکھ لیا گیا ہے۔ یہ دیکھنا لہروں، لکیروں کی شکل میں نہیں ہے بلکہ لہروں اور لکیروں کی روشنیوں کا انعکاس ہے۔ انعکاس چونکہ مادیت کے مظہر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس لئے نظر آجاتا ہے۔ جن شعاعوں یا لکیروں سے جسمانی خدوخال وجود میں آتے ہیں یہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔

۱۔ مفرد لکیریں ۲۔ مرکب لکیریں

لہریں مفرد ہوں یا مرکب..... خلا میں اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ وہ نہ ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ یہ لکیریں مفرد ہوں یا مرکب ہوں، مادی اجسام میں خدوخال بھی بنتی ہیں اور خدوخال کو ہر دوسرے فرد پر منعکس کرتی ہیں۔ ان لہروں یا لکیروں کے تاثرات سے حسیں (Senses) بنتی ہیں۔

ا: لکیریں اور لہریں دماغ کے اوپر جب نزول کرتی ہیں تو نزول کے بعد دماغ کے اوپر ہلکا سا دباؤ پڑتا ہے، اتنا ہلکا کہ حواس کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ یہ ہلکا سا دباؤ کسی بات سے متعلق، کسی عمل سے متعلق یا کسی زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ اس زندگی کا تعلق ماضی، حال اور مستقبل سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس دباؤ کا نام واہمہ ہے۔

۲: جب یہ دباؤ ذرا زیادہ ہوتا ہے تو حواس میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور اس ہلکے ارتعاش میں ذہن کے اوپر لہروں سے بنی تصویر کا بہت ہلکا سا خاکہ حواس کے اندر داخل ہو جاتا ہے، اس کیفیت کا نام خیال ہے۔

۳: روشنیوں کا نزول جب گہرا ہوتا ہے تو دماغ کے اوپر نقش و نگار واضح ہو جاتے ہیں۔ کسی چیز کا خاکہ جب نمایاں ہوتا ہے تو ذہن اس کی طرف منتقل ہونے لگتا ہے اور ذہن میں یہ بات آنے لگتی ہے کہ فلاں چیز کے بارے میں یہ خیال آرہا ہے۔ اس کیفیت کا نام تصور ہے۔

۴: اور جب تصور میں گہرائی ہو جاتی ہے تو احساس بن جاتا ہے۔

۵: احساس کے اندر رنگینی واقع ہو جاتی ہے تو وہ کیفیت جس کو ہم نے واہمہ، خیال، تصور اور احساس کہا ہے، اپنے پورے خدوخال کے ساتھ مظہر بن کر ہماری مادی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

دسمبر، ۱۹۹۵ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

شفیق بابا جی

السلام علیکم

اہل روحانیت اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ انسان اپنی ذات کے خول میں بند ہے اور جب تک وہ اپنی انا کے خول سے باہر نہیں نکلے گا اللہ کا عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کا عرفان حال کرنے کے لئے کن طرزوں کو اپنایا جائے کہ ذاتی انا کا خول شکست ریخت سے دوچار ہو جائے اور بندہ اپنے اللہ کا عرفان حاصل کرے۔

رومانہ عزی (قطر)

عزیزہ برخورداری رومانہ عزیز

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

جب ہم کائنات اور کائنات میں موجود نوعوں کے افراد کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیں اس تذکرے کو مکمل کرنے کے لئے تین مقامات سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ تین مقامات ہی دراصل کائنات کی تخلیق کا وہ عمل ہیں جس عمل پر کائنات موجود ہے اور کائنات میں زندگی کے آثار و حوال پائے جاتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ انسان جب انفرادی دائرے میں رہ کر سمجھنا چاہتا ہے تو اس کی سوچ محدود ہو جاتی ہے، اس کے اندر اخلاص نہیں ہوتا۔ کسی فرد کے اندر اخلاص کے معانی یہ ہیں کہ وہ انفرادی سوچ سے بالاتر ہو کر نوعی سوچ کو اپنالے۔ جب کوئی بندہ انفرادی طور پر آزاد ہو کر نوعی سوچ کو اپنا لیتا ہے تو اس کے اندر اخلاص کا چشمہ ابل پڑتا ہے۔ اس کی فہم و فراست انفرادیت سے نکل کر اجتماعی بن جاتی ہے۔ پھر یہی فرد جب اپنی نوع سے نکل کر کائنات کے اندر تمام نوعوں کے بارے میں تفکر کرتا ہے تو اخلاص کا یہ چشمہ آبشار کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پوری نوعوں پر محیط ہو جاتا ہے۔

اس صورت میں انسان کی فہم و فراست نوعی درجہ بندیوں سے گزر کر کائناتی بن جاتی ہے۔ جب کسی انسان کے اندر اس کی سوچ کائنات کو احاطہ کر لیتی ہے تو کائنات سے اس کا رشتہ مستحکم ہو جاتا ہے اور وہ کائنات میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیتا ہے۔

عظیم روحانی سائنس دان قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے بتایا ہے کہ فکر انسانی کی تین طرزیں ہیں۔ فکر انسانی کی پہلی طرز یہ ہے کہ وہ نوع انسانی کی حیثیت سے انفرادی طور پر انسان کے اندر پیدا ہونے والے تقاضوں کو صحیح طرزوں میں استعمال کرتا ہے تو اس کی ہر طرز

نوع انسانی کے لئے اخلاص کا جذبہ ہوتی ہے۔ جب کسی فرد کے اندر نوع انسانی کے لئے خلوص کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے تو وہ ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی فکر انفرادی تقاضوں سے ہٹ کر پوری نوعی تقاضوں کو سمجھنے اور محسوس کرنے لگتی ہے اور نوع انسانی کا فرد انفرادی حیثیت سے نکل کر اجتماعی حیثیت میں داخل ہو جاتا ہے، اس کی سوچ اور اس کے اندر پیدا ہونے والے تقاضے صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہتے۔ سوچ اور پورے تقاضے پوری نوع کو محیط ہو جاتے ہیں، انفرادی سوچ نوعی سوچ بن جاتی ہے۔

جب کسی فرد کے اندر نوع انسانی کے مجموعی تقاضوں کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت بیدار ہو جاتی ہے تو فکر ایسی وسعتوں میں داخل ہو جاتی ہے جہاں نوعی تقاضوں سے گزر کر کائنات کے مجموعی تقاضے اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ نوع انسانی کا ایک فرد جس پر انفرادیت محیط ہے جب نوعی تقاضوں کے لئے اپنے انفرادی تقاضوں کو مغلوب کر دیتا ہے تو اس کے اوپر کائنات کے رموز اور کائنات کے مجموعی تقاضے منکشف ہو جاتے ہیں، وہ کائناتی تقاضوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ جب کوئی فرد ان تینوں طرزوں سے گزر جاتا ہے تو انسانی فکر، ماورا فکر بن جاتی ہے اور یہ ماورا فکر ماورائے کائنات ہستی سے آگاہ کر دیتی ہے۔

انفرادی سوچ سے نکل جانا محدود طرز فکر کی فنا ہے۔ فنا در فنا، فنا در فنا کے مراحل سے گزر کر انسان ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتا ہے جس نقطہ کو فنا نہیں ہے، یہی وہ نقطہ ہے جو ذات مطلق ہے، یہی وہ انتہا ہے جہاں سے معرفت ذات کی ابتدا ہوتی ہے۔

تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے بعد ان کے علوم کے وارث اولیاء اللہ نے اسی طرز فکر کا پرچار کیا ہے کہ بندہ ایثار اور خلوص کا عملی نمونہ بن کر کائنات کے فعال رکن کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل کر لے۔

دعا گو
عظیمی

۲۹، دسمبر ۱۹۹۵ء
مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

السلام علیکم عظیمی صاحب،

یقین ہے آپ خیریت سے ہیں انشاءاللہ۔

آپ ہمہ وقت اللہ کی مخلوق کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔

بیماریوں کا علاج کرتے ہیں، مسائل کا حل بتاتے ہیں،

متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، اللہ نے آپ کو باطنی علوم سے نوازا ہے۔

آپ کی تصانیف باطنی علوم کا ذخیرہ ہیں

یہ نوع انسانی کے لئے خدمت ہے..... جس پر ہم آپ کے ممنون ہیں۔

آپ کی تعلیمات میں رسول اللہ ﷺ کی طرز فکر اور معرفت الٰہی کا پیغام ہے۔ آپ لوگوں کو علم دینا چاہتے ہیں لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ سے علمی سوالات پوچھنے والوں کی تعداد بہت کم اور مسائل پوچھنے والے بے شمار ہیں۔ ہمارے درمیان روحانی شخصیت موجود ہے لیکن ہم نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔

شکریہ

شیخ نصیر احمد

گرامی قدر شیخ نصیر احمد صاحب

وعلیکم السلام

میں جس قوم کا فرد ہوں اس کے اندر جس چیز کی طلب ہے یا وہ چاہتی ہے اور مجھے خطوط لکھتی ہے میں اس کی خدمت کر دیتا ہوں۔ کوئی صاحب علمی سوال کرتے ہیں، اللہ کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ میں علمی سوال کا جواب لکھ دیتا ہوں۔ یہ کام قوم کا ہے کہ اپنے میں سے ایک فرد کو وہ کس طرح استعمال کرتی ہے۔

یہ فقیر یورپ جاتا رہتا ہے، وہاں انگریز بلاتے ہیں۔ گلاسکو یونیورسٹی (جہاں سے سائنس نشوونما پاتی ہے) مجھے بلایا گیا۔ دو سو اسی (۲۸۰) انگریز خواتین و حضرات اور بیس پاکستانی تھے۔ ان دو سو اسی انگریز لوگوں میں سے ایک نے بھی ذاتی حالات سے متعلق سوال نہیں کیا..... جو پوچھا علم کے بارے میں سوال کیا۔ برطانیہ کے کئی بڑے چرچوں میں تقاریر کیں، وہاں بھی کسی ایک بندہ نے علمی سوال کے علاوہ کوئی سوال نہیں کیا۔ امریکہ اور کینیڈا میں ٹی وی پروگرام کے بعد ایسے لگا جیسے بھونچال آگیا ہو۔ ہر آدمی جو مجھ سے ملا یا جس نے فون کیا مراقبہ (Meditation) یا ماورائی علوم کے بارے میں وضاحت چاہی۔ اخباروں میں کالم چھپے۔ وہاں کے مشہور اخباروں نے انٹرویو شائع کئے۔ خطوط میں یہی سوال کیا گیا کہ یہ علم آپ کو کہاں سے حاصل ہوا، ہم بھی یہ Knowledge حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمان جہاں بھی ملے، وہ اپنے گھریلو مسائل میں الجھے ہوئے نظر آئے۔ سب سے زیادہ جادو مسلمان پر ہوتا ہے۔ آسیب اور جناب بھی اس ہی قوم پر عاشق ہوتے ہیں۔ شک اور بے یقینی کا عالم یہ ہے کہ بڑے بڑے عابد و زاہد حضرات و خواتین میرے پاس آتے ہیں کہ بیٹی نے سفلی کرادیا ہے، اس نے بہو پر اور بہو نے ساس پر کالا علم کرادیا ہے اور بڑی عجیب بات یہ ہے کہ اگر اسے کہا جائے کہ جادو نہیں ہے تو انہیں اعتبار نہیں آتا۔ میرے پاس عامل حضرات بھی آتے ہیں، وہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ جب تک ہم ایسے لوگوں کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے اور ان سے معقول رقم خرچ نہیں کرواتے انہیں یقین نہیں آتا۔ ہم لوگ ان کی کمزوری سے کیوں فائدہ نہ اٹھائیں اور پھر ہم انہیں بلانے بھی نہیں جاتے۔

اللہ کے فضل و کرم سے میں مخلوق کی خدمت کرتا ہوں۔ میرے ذہن میں پتہ نہیں کیوں یہ بات سما گئی ہے کہ ایک گھر تو ایسا ہو جہاں روحایت اور اللہ کی آیتوں کا کاروبار نہ ہو۔

اللہ کا کرم ہے کہ میری لکھی ہوئی کتابوں کی پذیرائی ہوتی ہے۔ اردو بازار والے کہتے ہیں کہ عظیمی صاحب کی کتابوں کا لوگ انتظار کرتے ہیں۔ میں اس وقت اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہوں، جب مجھ فقیر کی لکھی ہوئی کتاب لوگ ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ مجھ سے اپنی قوم کی جو بھی خدمت ہو گی اور ہو سکتی ہے، بس کرتا رہوں گا۔ مسلمان قوم مجھ سے اپنے دنیاوی مسائل کے بارے میں مشورہ کرتی ہے، یورپ والے اور پڑھے لکھے لوگ علم کی قدر کرتے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیمات عام ہو رہی ہیں۔

اسکاٹ لینڈ کے انگلش عظیمی بھائیوں نے پروگرام بنایا کہ ایک رسالہ نکالا جائے جو انگلش میں ہوگا۔ وہاں اس پروگرام میں کافی پیش رفت ہو چکی ہے۔ میں اپنی قوم سے ہر گز مایوس نہیں ہوا۔ اللہ کے فضل سے ایسی ٹیم تیار ہو گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے روحانی مشن کو ساری دنیا میں پھیلا دے گی۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو "توحید" کو ہر مذہب و ملت میں روشناس کرانے کی عملی جدوجہد کروں۔ اس عملی جدوجہد میں امراض کا علاج اور مسائل کا حل بھی ہے۔

یہاں ہر چیز فانی ہے، میں بھی فنائیت کی آخری سیڑھیوں پر ہوں لیکن آواز فضا میں ریکارڈ ہو جاتی ہے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

فروری ۱۹۹۶ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

عزیز از جان، روحانی فرزند، اورنگزیب عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

دل چاہتا ہے کہ آپ کو چند نصیحتیں کروں! ان کو غور سے سنو اور ان پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرو۔

۱۔ جو لوگ غصہ کرتے ہیں ایسے لوگ اللہ کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

۲۔ اولاد والدین کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ کوئی آدمی امانت کو خراب نہیں کرتا..... اس کی حفاظت کرتا ہے..... والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اولاد کو پیار دیں۔ ان سے دوستوں جیسا رویہ اختیار کریں۔

۳۔ والدین اگر زندہ ہوں، ان کی خدمت کی جائے۔ اگر وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو ان کی مغفرت کی دعا کریں..... قرآن پاک پڑھ کر بخشیں۔ نفلیں پڑھ کر ایصال ثواب کریں۔ روپیہ پیسہ ان کے لئے خرچ کریں۔ غریبوں کی مدد کریں۔ مسجدیں بنوائیں۔ ہسپتال کی تعمیر میں حصہ لیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہیں۔ ان کے پوتوں اور پوتیوں کو بھرپور پیار دیں۔ ضرورت سے زیادہ غصہ نہ کریں اور بے جا غصہ کرنے سے دادا دادی، نانا نانی کی روحیں پریشان ہوتی ہیں۔

۴۔ مراقبہ پابندی سے کریں۔ یا حی یا قیوم کثرت سے پڑھیں۔ گھر کو خوشی اور سکون کا مقام بنائیں۔

دعا گو

عظیمی

۴، اپریل ۱۹۹۶ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

جناب خواجہ صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاۃ

شاہ عبدالعزیز محدث، شاہ ولی اللہ، حضرت حاجی امداد اللہ مکی، مولانا احمد رضا خان، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہم سب کی تعلیمات یہ ہیں کہ بندہ کا اگر اللہ سے تعلق ہے تو اس کی نجات ہے اللہ سے تعلق نہیں ہے تو سوائے خسارے کے کچھ حاصل نہیں۔

خسرالدنیا والآخرۃ ذلک ھوالخسران المبین O الحج: ۱۱

ارکان اسلام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی حکمت پر غور کیا جائے تو یہی سمجھ میں آتا ہے ارکان اسلام پورے کرنے کا منشاء یہی ہے کہ اللہ سے تعلق قائم ہو جائے، اس سلسلہ میں رہنمائی فرمایئے۔

ظفر (ویتنام)

ترقی کے دو رخ ہیں۔ ترقی اور عزت و توقیر کی ایک حالت یہ ہے کہ کسی قم یا کسی فرد کو دنیاوی عزت اور دنیاوی دبدبہ اور دنیاوی شان و شوکت نصیب ہو۔ ترقی کا دوسرا رخ جو فی الواقع حقیقی رخ ہے۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ظاہری حالت میں رہتے ہوئے غیب کی دنیا میں جس فرد یا قوم کی رسائی اللہ کے نظام تک ہوتی ہے دراصل وہی اصل ترقی، عزت اور شان و شوکت ہے۔

ان دو رخوں پر غور کیا جائے تو یہ بات پوری طرح سامنے آجاتی ہے، بے شک وہ قومیں جنہوں نے علوم میں تفکر کیا ہے اور جدوجہد کے بعد نئی نئی اختراعات کی ہیں وہ دنیاوی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہی ترقی یافتہ قومیں سکون اور اطمینان سے محروم ہیں۔ قلبی اطمینان اور روحانی سکون سے قومیں اس لئے محروم ہیں کہ یہ حقیقت سے بے خبر ہیں یا حقیقی دنیا سے ابھی ان کا تعلق پیدا نہیں ہوا۔ حقیقت میں ذہنی انتشار نہیں ہوتا۔ حقیقت پر کبھی خوف اور غم کے سائے نہیں منڈلاتے، حقیقی دنیا سے متعارف لوگ ہمیشہ پُرسکون رہتے ہیں، ان کے اندر فساد نہیں ہوتا۔ موجودہ دور ترقی کا دور ہے لیکن اس ترقی کے ساتھ ساتھ جس قدر صعوبتیں، پریشانیاں، بے سکونی اور ذہنی انتشار سے نوع انسانی دوچار ہوئی ہے،

اس کی نظیر پہلے کے دور میں نہیں ملتی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ترقی کے پیچھے مادی اور ذاتی منفعت ہے۔اگر یہ ترقی فی الواقع نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے ہوتی تو قوموں کو اطمینان و سکون نصیب ہوتا۔

انفرادی یا اجتماعی ذہن کا تعلق طرز فکر سے ہے۔طرز فکر میں اگر یہ بات ہے کہ ہماری کوشش اور اختراعات سے نوع انسانی اور اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچے تو یہ طرز فکر انبیاء کی طرز فکر ہے اور یہی طرز فکر اللہ کی طرز فکر ہے۔اگر انسان اللہ کے اوپر فی الواقع یقین رکھتا ہے تو نئی نئی مصیبتوں، پریشانیوں، ذہنی انتشار اور عدم تحفظ کے احساس سے محفوظ رہتا ہے۔پُرسکون رہنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انسان کی سوچ اور انسان کی طرز فکر اس طرز فکر سے ہم رشتہ ہو جائے جو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرز فکر ہے۔

ہم جب زمین کے اوپر اور زمین کے اندر موجودات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اللہ نے اپنی مخلوق کے لئے بے شمار وسائل پیدا کئے ہیں، لیکن ان وسائل میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا تعلق اللہ کی کسی ضرورت سے ہو۔اللہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ باوجود یہ کہ اللہ ہر چیز سے بے نیاز ہے اور اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے وہ اپنی مخلوق کے لئے تسلسل کے ساتھ وسائل فراہم کر رہا ہے۔

چونکہ انسان وسائل کا محتاج ہے، اس لئے وہ وسائل سے اس طرح بے نیاز نہیں رہ سکتا کہ ہر چیز سے اپنا رشتہ منقطع کر لے لیکن یہ طرز فکر اختیار کر سکتا ہے کہ وسائل پوری نوع انسانی کے لئے ہیں، جس طرح میں ان سے فائدہ اٹھاتا ہوں اس ہی طرح سب کو فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔طرز فکر حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان جس طرز فکر کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس سے ذہنی قربت ہو اگر انسان اللہ کی طرز فکر کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے اللہ والوں کے پسندیدہ تمام مشاغل اپنانے ہوں گے۔انسان جس جس مناسبت سے ان مشاغل اور عادات کو اختیار کر لیتا ہے اس مناسبت سے طرز فکر بدل جاتی ہے اور تعلق باللہ قائم ہو جاتا ہے۔

پیغمبرانہ طرز فکر حاصل ہونے کے بعد مومن کو مرتبہ احسان حاصل ہو جاتا ہے۔وہ دیکھتا ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور وہ یہ دیکھ لیتا ہے، میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔

غور فرمایئے..... آدمی گناہ اس وقت کرتا ہے جب وہ یہ جان لیتا ہے مجھے کوئی دیکھ نہیں رہا..... جب انسان کے اندر یہ یقین اپنی پوری تابناکی کے ساتھ کارفرما ہو جاتا ہے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے تو وہ یقیناً گناہوں سے بچ جاتا ہے۔

دعا گو

عظیمی

۲۸،جون۱۹۹۶ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

عزت مآب محترم ومکرم مرشد کریم

السلام علیکم ورحمتہ الہ وبرکاۃ

دعاہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی عطافرمائے اور سلسلہ کے پیغام کی ترویج میں مزید ترقی اور برکتیں عطاہوں۔آمین

آپ یہاں تشریف لائے اور تشنہ روح کو سیرابی ملی۔جو وقت ساتھ گزاراوہ مختصر لگا۔امید ہے کہ جلد ملاقات نصیب ہو گی،انشاءاللہ

حالات وواقعات کے باعث اکثراوقات ذہنی انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ہدایات ورہنمائی کی درخواست ہے۔

آپ کے روحانی بچے.....

نثاراحمد،طاہرہ نثار عظیمی(مانچسٹر)

عزیزان گرامی قدر،نثاراحمد،طاہرہ نثار عظیمی

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

تقریباً۲۳دن کے بعد طبیعت لکھنے پر مائل ہوئی ہے۔پینڈنگ ڈاک لے کر صبح ۸بجے بیٹھ گیا تھا۔۱۲بجکر ۲۰منٹ پر تمام ارجنٹ خطوط پڑھ لئے ہیں،نوٹنگ کردی ہے تاکہ جواب لکھ دیا جائے۔آپ کواور طاہرہ کو بقلم خود خط لکھ رہاہوں۔

ہماراسب سے بڑا..... دشمن چھپااور کھلا دشمن شیطان ہے۔بڑے سے بڑاعالم فاضل آدمی اس کے سامنے طفل مکتب بھی نہیں ہے بلکہ انگوٹھا چوستا بچہ ہے۔الاّ یہ کہ آدمی کو علم الاسماء حاصل ہو جو ساڑھے گیارہ لاکھ آدمیوں میں جزوی طور پر ایک شخص کو بفضل ایزدی حاصل ہوتا ہے۔ہر آدمی آسانی سے شیطان کا آلہ کار بن جاتا ہے لیکن..... اگر اسے روحانیت کا سبق یاد ہو جائے تو وہ شیطانی مزاحمت کا سامنا کرتا ہے۔

بس یہی بات شیطان کے لئے سوہان روح ہے۔وہ ہر اس شخص کے پیچھے لگ جاتا ہے جو خلوص نیت سے روحانی راستہ پر چلنے کی جدوجہد یاآرزو کرتا ہے۔

روحانی زندگی مسلسل امتحان ہے، ایسا امتحان جس کا رزلٹ سامنے نہیں آتا۔ یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ ہم امتحان گاہ میں ہیں۔ سب اندھا کھاتہ ہے۔ اس کھاتے کی مرشد کے سوا کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی۔ روحانیت کا مقصد، یقین، عفوودرگزر، عاجزی، انکساری، خود کی نفی، درست ہوش و حواس کے ساتھ مرشد کے احکامات پر غور و تفکر..... اس طرح غور و تفکر کہ اپنی ذات کسی بھی طرح سامنے نہ آئے۔

ہالینڈ کے سفر کے دوران فیری میں اور ریل میں اتنی زیادہ باتیں ہوئیں کہ آپ کا ذہن پوری طرح احاطہ نہیں کر سکا۔ میں نے اگر آپ کے اور طاہرہ کے مستقبل کے بارے میں کچھ تعینات کئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ہو جائے گا یا ایسا کرنا ہے۔ مشکور و ممنون ہوں کہ آپ دونوں دوستوں نے میری خواہش پر اس جگہ کو آثار قدیمہ ہونے سے بچایا، اپنا وقت لگایا، چوٹیں کھائیں اور یہ سب مرشد کو خوش کرنے کے لئے کیا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً آپ کو صلہ عطا فرمائیں گے..... آپ کے اوپر عنایات الٰہی سایہ فگن رہی ہیں۔

نجی محفل میں عرض کیا تھا کہ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں لیکن معافی کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ جس کے مقدر میں جو ہوتا ہے بہر حال اسے ملتا ہے۔ اللہ کے سامنے عجز و انکساری سے اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس وقت میرے جذبات یہ ہیں کہ آپ ''انا'' کی دلدل کے کنارے کھڑے ہیں اور شیطان نے پوری توانائیوں کے ساتھ راستہ کھوٹا کرنے کا آغاز کر دیا ہے لیکن..... اللہ کی ذات پر یقین ہے کہ شیطان کا یہ وار خالی جائے گا اس لئے کہ آپ کے مرشد کے سر پر حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ اور سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سایہ ہے۔

میری ڈیوٹی اور ذمہ داری ہے کہ میں خیال رکھوں اور..... چاہنے والوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ روحانی باتوں کی حکمت پر غور کریں ..... امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کریں۔ اشاروں کنایوں میں بات کی جا سکتی ہے مگر پرچے کھولنے سے امتحان، امتحان نہیں رہتا۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ اللہ کرے کہ راستہ کھوٹا نہ ہو اور آپ حضرات بخیر و خوبی اس دلدل سے گزر جائیں۔

میرے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ سن لیجئے..... ایک پیر بھائی نے تھائی لینڈ سے حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے لئے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیجا تو اچھا نہیں لگا کہ مرشد کریم میرے پاس سے چلے جائیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے مرشد سے چند روز کے لئے بھی دور ہو جاؤں۔ اس خیال کے تحت میں نے پیر بھائی کو سخت سست کہہ دیا۔ رات کو دربار عالی مقام میں حاضری ہوئی تو سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا..... پیر بھائی کا نام لے کر.....

وہ کیسا آدمی ہے.....

عرض کیا

یارسول اللہ ﷺ وہ اچھے آدمی ہیں

آپ ﷺ نے فرمایا.....

اچھا آدمی برا کیسے ہو سکتا ہے..... جب آپ نے ایک دفعہ رائے قائم کرلی اور یہ تسلیم کر لیا کہ فلاں آدمی اچھا ہے تو اسے برا کہنا یا برا سمجھنا کیا معنی رکھتا ہے.....

لرزہ طاری ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اللہ کے محبوب ﷺ کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگی اور اگلے روز پیر بھائی سے دست بستہ معافی کا طلب گار ہوا۔

سنایئے! کہ آپ کیسے ہیں، بیگم کی صحت کیسی ہے، ماشاءاللہ کچھ کمی ہوئی ہے یا ترقی پذیر ہیں..... جس طرح مسلمان قوم یا مسلمان ملک ترقی پذیر ہیں..... ویسے آپ کی بیگم صاحبہ ترقی پذیر نہ ہوں تو اچھی بات ہے اور کچھ نہیں تو کار کا وزن ہی کچھ کم ہو گا، زیادہ تیز اور سبک چلے گی۔ آپ کی بہو کا وقت، پوتی کے ساتھ اچھا گزر رہا ہے۔ ایک بچہ کی مصروفیت تین بڑے آدمیوں کے برابر ہوتی ہے۔ رضا، علیم، تہمینہ اور کو میری طرف سے بہت بہت پیار دیں۔

آپ کے شب و روز میں کیا غیبت نہیں بڑھ گئی ہے..... دوسروں پر تنقید اور تبصرہ بھی غیبت کے زمرہ میں آتا ہے۔ جناب اخلاق مغل صاحب سے پوچھئے! مسجد ضرار کا کیا واقعہ ہے..... ہمیں یہ نہیں سوچنا کہ کوئی کیا کرتا ہے..... بلکہ..... اپنی اصلاح کی طرف توجہ دینی ہے۔ ہر آدمی کے لئے قبر مخصوص ہے۔ کوئی کسی کی قبر کے بارے میں کیوں کھوج لگائے..... ہمیں اپنا آپ شفاف کرنا ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے اس عاجز مسکین بندہ خواجہ شمس الدین عظیمی سے فرمایا.....

گرو جو کہے وہ کرو، گرو جو کرتا ہے اس کی نقل نہ کرو۔ گرو جو کہے گرو کے ذہن سے سمجھو، اپنا ذہن استعمال نہ کرو۔

مسجد کے لئے وضو خانہ کی تعمیر شروع کی تو حساب کتاب بجٹ سے باہر نکل گیا، ابھی پلاسٹر، اوپر کا ٹینک، نلکے، ٹونٹیاں، فرش باقی ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ مسجد کی چھت کے لئے یہ بھی کر دوں..... وہ بھی کام ہو جائے..... تاکہ انہیں آرام ملے..... سلسلہ کے کام احسن طریقے سے ہوتے رہیں۔

بھائی جان حکیم وقار یوسف عظیمی کہہ رہے تھے، ابا! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں..... آپ کی عمر آرام کرنے کی ہے، گھر میں رہیں، آخر ہمیں بھی آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے پوتوں اور پوتیوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ نے جنگل کو مسکن بنالیا ہے۔ آپ اور کتنا تھکیں گے اور کتنے زیادہ بیمار ہوں گے..... میں سوچتا ہوں، بچے بھی ٹھیک کہتے ہیں اور میں بھی ٹھیک ہوں۔

اگر میری زندگی، میری نسل کو لگ جائے تو سودا مہنگا نہیں ہے۔

الحمدللہ! میں بخیریت و عافیت ہوں، خوش ہوں۔

مبارک وصول کریں کہ مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے مزار شریف کی چھت پڑ گئی ہے۔ اللہ نے دعا قبول کی..... اللہ سب کے ارمان پورے کرے۔ آمین

سلسلہ عظیمیہ کے تمام حضرات اور خواتین کو سلام پہنچے۔

دعا گو

عظیمی

۲۴، اگست ۱۹۹۶ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

عزیز دوست ! پیارے بھائی، گرامی قدر رفیق سفر، روحانی فرزند، نور چشم،

عمران علوی سلمہ !

اللہ تعالیٰ آپ کے اوپر اپنی رحمتوں کی بارش برسائیں۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا محبت بھرا خط ملا۔

مرشد کیا ہے..... مرشد وہ ہوتا ہے جو اللہ سے دوستی کرادے اور دوستی جب ہوتی ہے کہ سالک اللہ سے محبت کرے اور یہ بات اس کا علم بن جائے کہ اللہ بھی اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ کائنات محبت کے علاوہ کچھ نہیں اور محبت مسلسل و متواتر حرکت ہے۔

مرشد، اللہ رب العالمین، غفور الرحیم کے محبوب رحمت اللعالمین کے اخلاق حسنہ کا پیروکار ہوتا ہے، اس کے اندر اگر عفو و درگزر نہ ہو تو مرشد نہیں ہے۔

آپ کو، آپ کے اہل خاندان کو اللہ تعالیٰ اپنی حفظ و امان میں رکھیں۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

بزرگوں کو سلام، چھوٹوں کو پیار۔

دعا گو

عظیمی

۲۵، اگست ۱۹۹۶ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

محترم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اللہ آپ کے اوپر اپنی رحمتوں کی بارش برسائیں۔آمین

کتاب ''مراقبہ'' میں بتایا گیا ہے کہ مادی جسم میں اکثر اعمال کو ہمارا شعور محسوس نہیں کرتا اور قبول نہیں کرتا۔

سوال یہ ہے کہ اعمال کہاں سے کنٹرول ہوتے ہیں..... اس بات کی وضاحت بھی فرمادیں کہ روشنی کی رفتار سے سفر کرنے سے کیا مراد ہے۔

ڈاکٹر اختر علی (کراچی)

وعلیکم السلام

تمام تجربات، مشاہدات اور محسوسات کا سورس ذہن ہے۔ خیالات ذہن میں مسلسل وارد ہوتے ہیں۔ کوئی لمحہ نہیں گزرتا جب ذہن میں خیال نہ آئے۔ بھوک پیاس کا تقاضہ، سونے جاگنے کا عمل، خوشی غمی اور دیگر جذبات، اولاد کی خواہش، پریشان حالی، وسوسے، جسمانی امراض اور نفسیاتی عوارض سب کے سب خیالات کے تابع ہیں۔ الہامی کتابیں اور آخری الہامی کتاب قرآن کریم رہنمائی کرتی ہے کہ ایک منبع ہے جہاں سے خیالات (انفارمیشن) وارد ہوتے ہیں۔ اسی سورس سے لاشمار اطلاعات (خیالات) ہر لمحہ، ہر آن نشر ہوتی رہتی ہیں۔ مثال آئینہ ہے، روشنی آئینہ کی سطح سے ٹکرا کر منعکس ہوتی ہے لیکن اگر روشنی کی شعاعوں کے سامنے ٹرانسپیرنٹ شیشہ رکھ دیا جائے تو روشنی اس میں سے چھن جاتی ہے.....انعکاس کا عمل واقع نہیں ہوتا۔ شعور اپنے علم اور دلچسپی کی بدولت مخصوص روشنیوں کو جذب کرتا ہے۔

جن روشنیوں کو شعور جذب کرتا ہے وہ شعور کے پردہ پر رک جاتی ہیں، آدمی انہیں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ جو روشنیاں شعور کے پردے میں سے گزر جاتی ہیں آدمی.....لاعلم رہتا ہے۔ شعوری میکانزم کے پس پردہ ایک اور ایجنسی ہے۔ شعور اسی ایجنسی کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ زندگی ہر دور میں اس ایجنسی سے وابستہ رہی ہے لیکن آدمی اس پر غور نہیں کرتا۔ اس لئے غور نہیں کرتا کہ زندگی ایک

معمول کے تحت گزر رہی ہے۔ جذبات، خیالات اور تقاضوں کے زیر اثر ذہن ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ خیالات کی یلغار سے آدمی کو ان مقامات کا ادراک نہیں ہوتا جو اس کی اصل ہیں۔ روزمرہ کے معمولات ظاہر کرتے ہیں کہ بامعنی زندگی گزارنے کے لئے جن اجزاء کی ضرورت ہے وہ ہمارے اندر ہیں۔ مادی زندگی میں بے شمار صلاحیتیں کام کرتی ہیں لیکن آدمی صرف پانچ حواس سے واقف ہے۔

۱۔ بصارت (دیکھنا)

۲۔ سماعت (سننا)

۳۔ گفتار (بولنا)

۴۔ شامہ (سونگھنا) اور

۵۔ لمس (چھونا)

یکسوئی کے ساتھ انفارمیشن کے منبع کی طرف متوجہ ہونے سے ایسی اطلاعات اور صلاحیتوں کا مشاہدہ ہوتا ہے جو عام طور پر حواس کی گرفت میں نہیں آتیں۔ بہت سے تجربات اور واقعات، مادی حواس کے علاوہ آدمی کے اندر موجود ایسے ادراک کا پتہ دیتے ہیں جن کو ماورائے ادراک حواس، چھٹی حس، وجدان، ضمیر، اندرونی آواز، روحانی پرواز وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔

علم روحانیت کے مطابق غیب میں لامتناہی روشنیاں ہیں۔ ان ہی روشنیوں میں کہکشانی نظام، سماوی مخلوق، خلاء میں آبادیاں اور روحانی علوم و اسرار شامل ہیں۔ جب آدمی اپنے اندر متوجہ ہوتا ہے تو شعوری آئینہ پر باطنی اطلاعات کی تصویریں بنتی ہیں اور نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔ آدمی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ کسی ایک نقطہ پر غور کرتا ہے تو غور و فکر اسے شعور کے پس پردہ لاشعور میں دھکیل دیتا ہے..... شعوری میکانزم کے پس پردہ ایجنسی (لاشعور) سے وہ کسی حد تک واقف ہو جاتا ہے۔

ہم جو کچھ دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں وہ ایسی شاہراہ پر سفر کر رہا ہے جو بظاہر آنکھوں سے اوجھل ہے لیکن شاہراہ کی موجودگی کے بغیر کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ موجودات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ آنے والے لمحہ کی تعمیر لمحات پر قائم ہے۔ حافظہ ہمیں کشش ثقل کا پابند رکھتا ہے۔ ہم وقت اور فاصلے کی پابندیوں میں صرف لمحہ حاضر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جن لمحات کا نام ماضی یا مستقبل رکھا جاتا ہے وہ شعور کی اسکرین پر جلوہ گر نہیں ہوتے۔ کائنات اور کائنات کے تمام اجزاء اور ان کے نقوش ایک ریکارڈ یا فلم کی شکل میں موجود

ہیں۔ ہماری مادی نگاہ اس ریکارڈ کا احاطہ نہیں کر سکتی لیکن ان نقوش کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں۔ رویا کی صلاحت انسان کو مادی سطح سے ماوراء علوم کی اطلاع فراہم کرتی ہے۔ یہ صلاحیت جب بر سر عمل ہوتی ہے..... دوری اور نزدیکی بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان کے اندر جو صلاحیتیں کام کرتی ہیں وہ تین دائروں میں مظہر بنتی ہیں۔ اس کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ آدمی کے تین جسم ہیں۔ مادی جسم، روشنی کا بنا ہوا جسم اور نور سے بنا ہوا جسم۔ یہ تینوں بیک وقت متحرک رہتے ہیں لیکن مادی جسم (شعور) صرف مادی حرکات کا علم رکھتا ہے، مادی جسم روشنی اور نور کے جسم کی تحریکات سے ناواقف ہے۔

روشنی کے جسم کی رفتار مادی جسم سے ستر ہزار گنا زیادہ ہے..... نور کا جسم روشنی کے جسم سے ہزاروں گنا تیز سفر کرتا ہے۔ روحانی استاد کی زیر نگرانی سالک کی ذہنی استعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے اور سالک کا شعور اس قابل ہو جاتا ہے کہ روشنی کی رفتار سے متحرک جسم کی تحریکات ادراک میں آجاتی ہیں۔

یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہاں روشنی سے مراد وہ روشنی نہیں ہے جو ہمیں نظر آتی ہے بلکہ یہ اس روشنی کا تذکرہ ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ اس طرح جب شعوری کیفیات نورانی دنیا میں جذب ہوتی ہیں تو سالک نور کے جسم اور اس کی تحریکات سے واقف ہو جاتا ہے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

فروری، ۱۹۹۷ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

ا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اچھائی اور برائی کیا ہے۔

۲۔ روحانی علوم کے لئے مرشد کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔

۳۔ بندہ جب حقیقت کی تلاش میں نکلتا ہے تو کیا اسے خود معلوم نہیں ہو جاتا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔

شکریہ

رفعت صدیقی

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

رفعت صدیقی صاحبہ

دانشوروں کا تجزیہ ہے کہ زندگی دراصل خیالات کی ایک فلم ہے اور یہ فلم دماغی اسکرین پر تسلسل اور تواتر کے ساتھ ڈسپلے (Display) ہو رہی ہے۔ خیالات کے بارے میں غور و فکر ہمیں اس حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ ایک ہی خیال کو مختلف معانی پہنانے کا نام تکمیل ہے۔ بھوک کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو پیٹ بھرنے کے مخصوص عمل کو اچھا قرار دیتے ہیں اور پیٹ بھرنے کے اسی عمل کو برائی سے منسوب کرتے ہیں۔

شادی ایک عمل ہے جس پر نوع کی بقا کا انحصار ہے۔ اگر قاعدوں اور ضابطوں کے ساتھ اس عمل کی تکمیل ہوتی ہے تو یہ خیر ہے اور یہی عمل متعین قاعدوں اور ضابطوں کے خلاف کیا جائے تو برائی ہے حالانکہ نتائج کے اعتبار سے عمل کے دونوں رخوں کا ایک ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

عمل کی پہچان یہ ہے کہ ایک عمل کرنے سے ضمیر خوش ہوتا ہے اور اس کے اندر سکون اور اطمینان کی لہریں موجزن ہوتی ہیں۔ عمل کی دوسری پہچان یہ ہے کہ ضمیر ناخوش ہوتا ہے اور آدمی کو اس عمل سے ندامت ہوتی ہے۔

انسان دراصل ایک درخت ہے اور اس کی زندگی کے اعمال و کردار درخت کے پھل ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ یہی صورت حال اعمال کی ہے۔ صداقت کا فیصلہ ماخذ سے نہیں..... نتائج سے مرتب ہوتا ہے۔ کسی کے اندر نیکی کے تصورات یا برائی کے بارے میں حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ آدمی کا اپنا فعل اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ کسی فعل کو پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ عمل معاشرہ پر کس طرح اثرانداز ہو رہا ہے۔ اگر اس میں صدق نیت موجود ہے تو یہ عمل صحیح ہے۔

تصوف میں یہ مسئلہ متنازعہ رہا ہے کہ انسان کے اندر جب روحانی قوتیں متحرک اور کارفرما ہوتی ہیں تو کیسے سمجھا جائے کہ ان حالتوں میں حقیقت کی رنگینی ہے یا شیطان کی کارفرمائی۔ مذہب میں بھی اس مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ روحانی واردات و کیفیات حقیقت پر مبنی نہ ہوں تو اس بات کا گمان، یقین میں بدل جاتا ہے کہ شیطانی وسوسے، آدم ذات کو نچلے گڑھے میں پھینک دیتے ہیں۔ جن لوگوں کے جسمانی تقاضے، روحانی کیفیات سے ہم رشتہ رہتے ہیں، ان کا طرز تکلم اور طرز تعلیم اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ بندہ جسم و جان کے رشتہ سے واقف ہے۔

روح اور جسم کے مشترک نظام میں جب حرکت پیدا ہوتی ہے تو بندہ خود کو خوشی اور ایثار کے جذبہ میں ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ نوع انسانی کے ہر فرد اور کائنات کے تمام افراد کو اس نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے ماں اپنے بچوں کو دیکھتی ہے۔

اس سرشت میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ میرا رشتہ کائنات کے تمام افراد سے قائم ہے۔ جس طرح کائنات میرے اندر بسی ہوئی ہے اسی طرح کائنات کا ہر فرد دل کے آئینہ پر اپنا عکس ڈال رہا ہے۔ فرد جب چاہے اپنے اندر اس عکس سے رابطہ کر سکتا ہے۔ شیطانی تفکر، ابلیسی طرز فکر اور برائی کے تشخص کو تشنج میں مبتلا کر دیتی ہے۔ چہرہ پر ملاحت، صباحت اور معصومیت کی جگہ بدصورتی اور خشکی آجاتی ہے۔

ہر شخص پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک تجربات کی دستاویز ہے۔ دستاویز میں بھلائی سرایت کر گئی ہے تو دستاویز قیمتی اور فائدہ مند ہے۔ رگ و پے میں اگر برائی رچ بس گئی ہے تو دستاویز بھیانک اور بھونڈی ہے۔ بہترین دستاویز فرد کے لئے خود آگہی کا ذریعہ ہے اور بدترین دستاویز اس کے اندر بے حسی، خود غرضی اور لالچ پیدا کرتی ہے۔ اگر فرد سکون سے آشنا ہے تو وہ دوسروں کے لئے طمانیت قلب کا ذریعہ ہے۔ اس کا سایہ ٹھنڈا اور فرحت بخش ہے، اس کی روحانی کیفیات حقیقی ہیں اور اگر وہ خود سکون سے دور ہے۔ اس کے

اوپر غم کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ وہ خوف وڈر کی خشک اور آب و گیاہ وادیوں میں غلطاں و پیچاں ہے تو یہ کیفیت شیطانی وسوسہ ہے اور اس کی ساری زندگی دھوکا ہے۔

زندگی کی اچھی دستاویز رکھنے والا بندہ اللہ سے قریبی تعلق رکھتا ہے اور قربت سے لطف اٹھاتا ہے۔ ہر سانس میں اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ اللہ کو اپنے اندر جلوہ گر دیکھتا ہے، جو اللہ کہتا ہے وہ سنتا ہے اور جو دعا کرتا ہے اللہ اسے قبول فرما لیتے ہیں۔ خالق کائنات سے ہم کلامی میں زندگی کے وہ راز منکشف ہوتے ہیں جو سب کو معلوم نہیں ہوتے۔ اس احساس کی بدولت وہ اپنی اصل کو پہچان لیتا ہے۔

وہ جان لیتا ہے کہ اس کا جینا، مرنا اور ایک عالم سے دوسرے عالم میں زندگی گزارنے میں کیا اسرار ہیں۔ ایسا بندہ ہر آن اور ہر لمحہ اللہ کی صفات کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ جسمانی طور پر وہ عام لوگوں کی طرح ہوتا ہے لیکن اس کا ضمیر اور قلب مطمئن ہوتا ہے۔

بزرگوں نے یہ قاعدہ بنایا ہے کہ جس طرح ظاہری علوم سیکھنے کے لئے استاد کی ضرورت ہے اسی طرح روحانیت اور باطنی علوم کے حصول کے لئے استاد (مرشد کامل) کی نگرانی اور سرپرستی لازم ہے۔ سالک دورانِ تربیت جب اپنی واردات کیفیات روحانی استاد کے گوش گزار کرتا ہے تو کامل استاد چونکہ خود اس شاہراہ سے گزر چکا ہے اور اس کے اندر نبوت کی فراست موجزن ہے، دیکھ لیتا ہے کہ سالک نے جس شے کا مشاہدہ کیا ہے یا جو محسوسات سالک پر مرتب ہوئے ہیں ان میں مثبت طرزِ فکر کا عمل دخل زیادہ ہے یا ابلیس کی کارستانی شامل ہے۔ اسی لئے ماورائی علوم کے طالب علموں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنی واردات و کیفیات روحانی استاد کو ضرور بتائیں اور خود سے ان میں معانی نہ پہنائیں۔

دعا گو

عظیمی

مئی ۱۹۹۷ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

محترم مرشد کریم

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ

ایک شخص کسی کو بہت اچھا کہتا ہے پھر دو منٹ بعد اسی شخص کو بُرا کہتا ہے۔ اراہ کرم میرے اس سوال کی روحانی طور پر تشریح فرمادیں۔

(خطارسال کنندہ نے اپنانام اور پتہ تحریر نہیں کیا)۔

نام۔نامعلوم

مرشد کریم رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایاہے کہ آدمی کی گفتگو میں مبالغہ بہت ہوتاہے۔ یہ بشری کمزوری ہے اس پر کوئی آدمی عبور نہیں پاسکتا۔اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی آدمی کو بُرانہ کہو۔ اگر وہ براہے وہ جانے ،اللہ جانے۔ اگر اچھائی میں مبالغہ ہوگا، جزا نہیں ملے گی تو سزا بھی نہیں ملے گی۔ بہتر طریقہ یہی ہے کہ کوئی آدمی بُراہو، اچھاہو، اسے اچھا سمجھے اگر وہ بُراہے تب بھی اسے اچھا کہو۔ ویسے یہ ہے مشکل کام،اس لئے کہ ایک آدمی ہے اس نے آپ کے ساتھ خلوص ومحبت کے ساتھ اچھا سلوک کیا جس کی بناپر آپ اسے اچھا سمجھنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے آپ کو پریشان کیا تو آپ اس کے خلاف ہوگئے، بُرا بھلا کہنے لگے لیکن سوال یہ ہے کہ آپ نے اسے اچھا کیوں کہا تھا۔ ایک دفعہ آپ اچھا کہہ چکے ہیں، اب آپ اسے بُرانہ کہیں اس لئے کہ پہلے اچھا کہہ چکے ہیں۔

قومیں ذاتوں اور قبیلوں سے بنتی ہیں۔ قوموں سے نوعیں بنتی ہیں۔ پہلے انفرادیت ہوتی ہے پھر انفرادیت سے قبیلے بنتے ہیں۔ ایک ذہن، ایک طرزِ فکر کے بہت سارے افراد کے ایک جمع ہو جانے سے خاندان بنتا ہے۔ کئی چھوٹے خاندان ایک ہی طرزِ فکر کے جمع ہو جائیں اسے قبیلہ کہتے ہیں۔ کئی قبیلے مختلف طرزِ فکر کے ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اسے قوم کہتے ہیں۔

اور کئی مختلف نظریات کی قومیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اسے نوع کہتے ہیں۔ یعنی فرد ہوگا تو خاندان اور کنبہ بنے گا۔ جب آپ نے اپنی طرزِ فکر یعنی معاشرتی طرزِ فکر یہ بنالی کہ اپنی ذات سے کسی دوسری ذات کو تکلیف نہیں پہنچے گی، کسی بھی فرد کو بُرا نہیں کہیں

گے تو خاندان میں ایک باپ نے اصول بنالیا۔اب اس کی اولادیں ہیں،دس کی دس نہیں چھ تو اس کی طرزِ فکر پر چلیں گی۔مفہوم یہ ہے کہ آپ نے اچھائی کا ایک دروازہ کھول دیا۔چھ نسلیں اچھی بنیں۔

حضور قلندر باباولیار حمتہ اللہ علیہ نے فرمایا انفرادی سوچ بے کار ہے اجتماعی سوچ زندگی ہے۔اجتماعی سوچ سے آدمی کشش ثقل (Gravity) کو توڑ سکتا ہے۔انفرادی سوچ سے آدمی کشش ثقل کو نہیں توڑ سکتا اور جب آپ کشش ثقل کو نہیں توڑ سکتے تو ظاہر ہے کہ زمین میں قید ہیں۔زمین سے نکلنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ پرندوں کی طرح اڑنے لگیں۔آدم اور کبوتر میں ایک فرق یہ ہے کہ کبوتر اڑتا ہے آدمی اڑتا نہیں۔جتنا زیادہ اجتماعیت سے دور ہوگا وہ انفرادی خول میں بند ہوتا رہے گا اور جتنا آدمی اپنی اصل سے واقف ہوگا وہ انفرادی خول سے آزاد ہوگا۔

روحانیت تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ فرد انفرادیت سے

آزاد ہو جائے اور ذہن کو اجتماعی بنالے۔

جب آپ اجتماعی ذہن بنالیں گے تو ذہن لا محدود دائرے میں داخل ہو گیا۔اب کوئی آدمی بُرا کہے گا تو آپ کو بُرا نہیں لگے گا۔بُرا محسوس کرنا انفرادی سوچ ہے۔تعریف پر آدمی خوش ہوتا ہے انفرادی سوچ خوشامد کو پسند کرتی ہے۔اجتماعی سوچ میں خوشامد نہیں ہے۔جب تک اخلاص نہ ہو اجتماعیت میں داخل نہیں ہو سکتے۔اجتماعیت کے برعکس رُخ انفرادیت ہے۔شعور محدود ہے۔

انفرادیت کے اندر آپ مستقل خوشی حاصل کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔خوشی حاسل کرنی ہے تو خوشی اور غم دونوں سے گزرنا ہوگا۔خوشی اور غم دونوں کیفیتیں محدود ہیں۔خوشی کی بھی ایک حد ہے اور غم کی بھی۔خوشی کا بھی وقت ہے غم کا بھی وقت ہے۔یہ الگ بات ہے کہ خوشی کا وقت نہیں معلوم ہوتا،سالوں گزر جائیں تو لگتا ہے کہ ایک دن گزرا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ خوشی اور غم محدود کیفیت ہیں۔اگر انفرادیت کے خول سے باہر نکل کر اجتماعیت کو قبول کر لیا جائے تو خوشی اور غم کی گرفت ٹوٹ جائے گی۔

ہر خوشی اک وقفہ تیاری سامان غم

ہر سکوں مہلت برائے امتحاں واضطراب

دعا گو

عظیمی

۵ مئی ۱۹۹۷ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

روحانی مکاشفات یا واردات کو پڑھتے ہوئے ماورایت کا احساس ہوتا ہے۔ماڈرن تہذیب کے کچھ لوگ روحانیت کو قوتِ متخلیہ کی جلوہ سامانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ان لوگوں کے لئے آپ اس عقدہ کس طرح کھولیں گے ؟

ناصر محبوب (ماسکو روس)

آدم جب سے زمین پر آباد ہے اس علم سے واقف ہوتا رہا کہ زمین کے اندر ایسی چھپی ہوئی طاقتیں موجود ہیں جن سے زندگی کے لئے وسائل فراہم ہوتے ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ بیج بویا جاتا ہے تو بیج کی طاقت اور زمین کی طاقت مل کر ضرب ہوتی ہے۔ نتیجہ میں تیسری چیز کا وجود پیکر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔سائنسی نکتہ نظر سے کہا جاسکتا ہے کہ بیج کے اندر انرجی زمین کی انرجی سے مل کر مظاہرہ کرتی ہے تو پودا نمودار ہوتا ہے اور بڑھ کر تناور درخت بن جاتا ہے۔اس درخت میں پھل اور پھول لگتے ہیں۔بیج اور زمین کے اندر طاقت کی کنہ کیا ہے۔

بیج ایک تشخیص ہے اور بیج کے اندر صفات درخت ہے جو نشو ونما پانے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔بیج کا دوسرا وصف یہ ہے کہ بیج صفت کا مظاہرہ کرتا ہے یعنی پھول بنتا ہے تو اس کے اندر بھی بیج ہوتے ہیں۔درخت کا بیج ہو،بیج کے اندر رنگ ہو،رنگوں میں امتزاج ہو اور غلاف میں بند ہو یہ سب صفات کا مظاہرہ ہیں۔

روحانی انسان بیج کا تجزیہ کرتا ہے اور انر میں موجود روشنی سے بیج کے اندر تفکر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ بیج صفاتی مظہر ہے۔ہم جب عقل و شعور کے اعتبار سے بیج کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتے تو بالآخر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ کی صفات کو سمجھنا محدود و عقل و شعور سے ماورا ہے۔ محدودیت سے نکلنے کے لئے ارتکاز توجہ یا مراقبہ پہلا طریقہ ہے۔

زیادہ پڑھے لکھے لوگ،سائنسی نظریات کی بھول بھلیوں میں گم افراد، عقل و شعور سے آراستہ دانشور جب روحانی علوم کے اندر غور کرتے ہیں (کیونکہ ان علوم کو وہ عقل و شعور کے دائرہ میں بند کرنا چاہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر لامتناہی علم کو تناہیت میں قید کرنا چاہتے ہیں۔)اور ان کے سامنے جب کوئی حل نہیں آتا تو وہ روحانیت کو قوتِ متخلیہ کہہ دیتے ہیں۔روحانیت کو قوت متخلیہ کہہ کر گزر جانے کے بعد تحقیق و تلاش کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک قوت متخلیہ کا تعلق ہے خیال کی کارفرمائی سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔زندگی کے سارے اعمال و اشغال قوت متخیلہ کے اوپر قائم ہیں۔دانشور یہ تو کہتے ہیں کہ روحانیت قوت متخیلہ کا مرکب

ہے لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ قوت متخیلہ کیا ہے؟ جتنی ترقی سامنے آچکی ہے اور آئے گی سب میں ربط قائم کیا جائے تو کہا جائے گا کہ یہ سب قوت متخیلہ ہے۔

دانش وروں کے دماغ میں خیال آیا کہ ایسا ہتھیار ایجاد کرنا چاہیے جس سے بیک وقت لاکھوں جانیں موت کے گھاٹ اتر جائیں۔ دوسرے کو خیال آیا کہ ایسا آلہ ایجاد کیا جائے جو آوازوں کو پکڑ لے۔ تیسرے کے دماغ میں خیال ایا کہ ایسی اسکرین بنانی چاہیئے جس اسکرین پر دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے پر تصویر منعکس ہو جائے۔ یہ سب ایجادات کسی ایک بندہ کے ذہن سے شروع ہوئیں۔ اس خیال پر زہنی استعداد کو مسلسل اور متواتر مرکوز کیا گیا تو نئی نئی ایجادات وجود میں آتی رہیں۔ سوال یہ ہے اگر تحقیق و تلاش کے نتیجہ میں کوئی ایجاد کسی ایک دانشور تک محدود رہ جاتی اور دوسرے لوگ اپنی خیالی قوت کو اس ایجاد پر استعمال نہ کرتے تو ایجاد کس طرح وجود میں آتی۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

یہ کہہ دینا کہ روحانیت قوت متخیلہ ہے، کم فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ روحانیت میں خیال ایسی اطلاع کو کہا جاتا ہے جو اطلاع مسلسل اور متواتر کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو جائے۔ جب کوئی اطلاع یا خیال کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو جائے تو بالآخر وہ چیز جو خیال میں موجود ہے، مظہر بن جاتی ہے۔۔۔ مظہر صفات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ روحانی انسان برگد کے درخت کا تذکرہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ بیج نے اپنی صفات کا مظاہرہ ہونا شروع ہو گیا۔ یہ مظاہرہ بڑے درخت کی شکل میں زمین کے اوپر نمودار ہو گیا۔

صفات دراصل آدمی کے اندر اطلاعات کا ذخیرہ ہے۔ ان اطلاعات میں سے چند یا پوری اطلاعات کو انسان خیال کی طاقت سے ایک نقطہ پر مرکوز کر دیتا ہے تو خیال کے اندر لامتناہی اطلاعات میں ابال آجاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے، مظاہرات آنے لگتے ہیں۔ خیالات کا ایک نقطہ پر مرکوز ہونا مراقبہ ہے۔

زندگی کیا ہے۔۔۔ اگر خیال کی کارفرمائی نہ ہو تو ہم کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ بھوک پیاس، گرم سرد کا احساس، سونا جاگنا، غمگیں یا خوش ہونا کیا خیال کی گرفت سے باہر ہے؟۔۔۔ ہم جب بھوک پیاس، شادی اولاد اور کسی بھی عمل کا ارادہ کرتے ہیں تو زندگی

کے یہ سب عوامل خیال کے تابع نہیں ہیں۔۔۔۔بتایئے پیدائش سے پہلے، پیدائش کے بعد کوئی عمل ایسا ہے جس کا خیال نہ آتا ہو اور وہ ہو جاتا ہو۔

دعا گو

عظیمی

۲ جنوری ۱۹۹۸ء

مرکزی مراقبہ ہال، سرجانی ٹاؤن۔ کراچی

گرامی قدر خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

کسی بھی روحانی سلسلہ میں صاحب سلسلہ کے ابتدائی مریدین پر عنایات ونوازشات کی بارش کچھ زیادہ ہوتی ہے اور مرشد سے علم حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس زیادہ وقت ہوتا ہے۔اس کے مقابلے میں دس پندرہ سالوں بعد بیعت ہونے والوں کو یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی مرشد کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے۔اگر ایسے مریدین کی باطنی نگاہ بیدار ہونے سے قبل مرشد عالم بالا تشریف لے جائیں تو پھر ان مریدین کا مستقبل کیا ہوگا؟

کیا آخرت کی زندگی میں منتقل ہو جانے کے بعد بھی مرشد کریم ان کی تربیت کرتے رہتے ہیں یا مرشد انہیں کسی کے سپرد کر دیتے ہیں یا پھر ایسے مرید بے یار و مددگار ہی رہ جاتے ہیں؟

مزید برآں دنیاوی زندگی میں جب مرید کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ براہ راست اپنے مرشد سے رجوع کرتا ہے۔مرشد کے وصال کے بعد مرید کس سے رجوع کرے گا؟

شبیر احمد (ساہیوال)

وعلیکم اسلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

ابتدائی دور میں چونکہ شاگرد کم ہوتے ہیں اس لئے استاد کی توجہ ان پر زیادہ ہوتی ہے۔ہر دور میں ایسے لوگوں کی تعداد موجود رہتی ہے جو مرشد یا استاد کے قریب رہتے ہیں۔اس قربت میں شاگردوں کے ذوق وشوق کا زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔

کئی مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاگرد یا مرید استاد کے پاس برسوں قیام کرتا ہے اور اس کی زندگی میں تبدیلی تو آتی ہے لیکن۔۔۔کوئی ایسی انقلابی تبدیلی نہیں آتی جس کی بنیاد پر وہ استاد کی طرح دوسرے لوگوں کو علوم منتقل کرے۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعد کے آنے والے لوگ بہت جلدی تعلیم وتربیت دینے کے اہل ہو جاتے ہیں۔دنیاوی علم وہنر ہوں یا روحانی اقدار کی آبیاری کی جائے،

دونوں میں ذوق و شوق کا عمل دخل کار فرما ہے۔ جتنا ذوق و شوق شاگرد کے اندر ہوتا ہے اسی مناسبت سے وہ استاد کے قریب ہو جاتا ہے۔اس میں ابتدائی، درمیانی یا عمر کے آخری دور سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اسی طرح کا ایک سوال میں نے اپنے مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ سے کیا تھا۔ جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ آپ کی معلومات میں اضافہ کے لئے پیشِ خدمت ہے۔۔ایک پیر صاحب کے دو مرید تھے۔ دونوں اتنے قریب تھے کہ گھر آنا جانا، ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ان کی اولاد اپنی کی طرح تھا۔ ان میں سے ایک نے چند سال کے بعد کہنا شروع کر دیا کہ مجھے میرا روحانی حصہ دیا جائے۔ پیر صاحب اسے تسلی دیتے رہے لیکن جب اُس نے بہت زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے توجہ کی اور رخصت کر دیا۔ دوسرا مرید بدستور قربت میں رہا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مرشد صاحب اس دنیا سے اُس دنیا میں تشریف لے گئے۔ مرید نے سوچا کہ میری حیثیت بڑے بھائی کی ہے لہذا مجھے اپنے بہن بھائیوں کی پرورش میں اپنی روحانی ماں کا ساتھ دینا چاہیئے۔ سالوں گذر گئے۔ پیر و مرشد صاحب کے بیٹے او بیٹیوں کی شادی سے فارغ ہو کر انہوں نے اماں سے درخواست کی۔۔۔ماں جی! مجھے اجازت دیں۔ اجازت لے کر مزار شریف پر حاضر ہوئے اور سلام دعا کر کے رخصت ہو گئے۔ دوبارہ روضہ کے اندر گئے اور واپس آ گئے۔

تیسری بار پھر یہ سوچ کر کہ اب پتہ نہیں کب آنا ہو گا یا نہیں آنا ہو گا، اپنے مرشد کی قبر سے لپٹ کر رونے لگے۔ روتے روتے اس عالم سے اُس عالم میں منتقل ہو گئے۔ دیکھا کہ مرشد مرید کو سینہ سے لگا کر پیشانی اور آنکھوں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ جب اُس عالم سے اس عالم آئے تو پیر و مرشد کے رنگ میں رنگین تھے۔ شاداں و فرماں مزار سے باہر آئے اور اپنے شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں پیر بھائی کا شہر پڑتا تھا۔ دل چاہا کہ ملاقات کر کے جاؤں۔ شہر پہنچے تو ہنگامہ برپا دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک بزرگ اناپ شناپ بولتے ہیں جس کی وجہ سے شرعی عدالت نے انہیں سنگساری کی سزا دے دی ہے۔ یہ اناپ شناپ بولنے والے بزرگ ان کے پیر بھائی تھے۔ علیک سلیک ہوئی اور کہا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو یہ دراصل ان رازوں کا اظہار ہے جن کو کبھی ظاہر نہیں کیا جاتا۔ جب وہ کسی طرح قائل نہ ہوئے، یہ صاحب عدالت شرعیہ کے جج کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ اگر آپ سزا میں ایک ہفتہ کی تاخیر کر دیں تو ایک بندہ کی جان بچ جائے گی۔ دوبارہ اپنے پیر بھائی کے پاس گئے اور آہستہ آہستہ ان کی بیدار روحانی صلاحیت پر وہ آ گیا پھر ان کو حاکم کے سامنے پیش کر دیا۔ حاکم کے دربار میں جب اس مرید کو الزامات کی فہرست سنائی گئی جن بنا پر سنگساری کی سزا دی گئی

تھی تو مرید نے ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ نتیجہ میں ان کی سزا معاف ہو گئی اور پیر بھائی اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

یہ بات کہ مرشد کے انتقال کے بعد فیض جاری و ساری رہتا ہے، اس کی تصدیق سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد گرامی سے ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، جب قبرستان جاؤ تو "اسلام علیکم اہلِ قبور" کہو۔ قبرستان میں رہنے والے تمہارے سلام سنتے ہیں اور تمہیں جواب بھی دیتے ہیں، جو تم نہیں سنتے۔

اس فرمان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں روح سنتی بھی ہے اور بولتی بھی ہے۔ جب عام آدمی کی روح بولتی اور سنتی ہے تو روحانی بزرگوں کا بولنا اور سننا، آنے والوں کے لئے دعا کرنا، ان کو فیض پہنچانا ثابت ہو جاتا ہے۔

عام روح جب سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کہتی ہے تو دراصل وہ قبرستان آنے والے بندے کے لئے دعائے خیر کرتی ہے دعائے خیر کو یقیناً کسی نہ کسی درجے میں فیض کا مقام حاصل ہے۔ لہذا مرشد کے وصال کے بعد مرید کے ذوق و شوق کے مطابق رہنمائی بھی ملتی ہے اور فیض بھی جاری رہتا ہے۔ مرشد کا مقام یہ ہے کہ اگر اللہ کا دوست ہے تو اللہ اس کی درخواست کو قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

"میں اپنے بندہ کو دوست رکھتا ہوں اور میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ کسی چیز کو پکڑتا ہے۔ (صحیح بخاری)

دعا گو

عظیمی

مارچ ۱۹۹۸ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

عزیزہ برخوداری رفعت سلمہا

۱۔انسان جب تک گوشت پوست اور ہڈیوں کا پتلا ہے اس میں کوئی حرکت نہیں ہوتی اور جب تک گوشت پوست کے اندر روح کام کرتی رہتی ہے تو حرکت رہتی ہے۔

۲۔روح ہر آدمی کی جان ہے۔روح نہیں رہتی تو جان بھی ختم ہو جاتی ہے۔

۳۔یہاں کوئی چیز مستقل نہیں ہے۔ہر شے گھٹتی، بڑھتی اور فنا ہوتی رہتی ہے لیکن روح باقی رہتی ہے۔

۴۔عقل والے لوگ ہمیشہ اپنی ذات، اپنی انا اور اپنی روح کے کھوج میں سر گرداں رہتے ہیں اور جب وہ روح سے واقف ہو جاتے ہیں تو ان کے اوپر سے غم اور خوف ختم ہو جاتا ہے۔جن لوگوں کو غم اور خوف نہیں ہوتا وہ اللہ کے دوست بن جاتے ہیں۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

۱۵اپریل۱۹۹۸ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

جناب عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

میرے اندر بے شمار حیران کن صلاحیتیں ہیں لیکن میں کئی اہم صلاحیتوں سے محروم ہوں۔ تصوف سے مجھے بڑا لگاؤ ہے۔ اللہ کے برگزیدہ اور محبوب بندوں کے قصوں اور احوال کا مطالعہ کرنا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ تصوف کے بارے میں خاصی معلومات رکھتا ہوں۔ خلیفہ محمود نظامانی صاحب فرماتے تھے کہ جن لوگوں کو کامل مرشد مل جاتا ہے ان کے لئے ان کا مرشد ہی پارس ہوتا ہے۔

عظیمی صاحب! کیا مجھے مرشد کامل نہیں مل سکتا۔۔۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔۔۔ میں بہت سی باتیں کہنا چاہتا ہوں لیکن خیالات کو الفاظ کا روپ نہیں دے سکتا۔ اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ یا تو مجھے گھسیٹ کر روحانیت میں داخل کر دیں تاکہ مجھے مجاہدوں کی ضرورت نہ پڑے یا پھر میرے اندر مجاہدوں کی عادت ڈال دیں۔ مستقل مزاجی، قوتِ ارادی، ہمت اور چاہت پیدا کریں۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔

نظامانی (ٹنڈو جام)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

روحانیت نہ تو کھیل تماشا ہے اور نہ سیال شے ہے کہ گھول کے پلا دی جائے۔ آپ کوئی بھی علم سیکھنا چاہیں اس میں ریاضت و مجاہدہ کی لازماً ضرورت پڑتی ہے۔ بچہ صبح سویرے بیدار ہوتا ہے، تیار ہوتا ہے، اسکول جاتا ہے، دوپہر تک کلاس میں رہتا ہے، تپتی دھوپ میں گھر آتا ہے، گھر آتے آتے چکر آجاتے ہیں۔

بعض اوقات گرمی سے نڈھال ہو کر بچے گھر میں آکر گر جاتے ہیں اور اگلی صبح یہی عمل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔۔۔ یہ عمل ریاضت اور مجاہدہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

ایک آدمی کہیں ملازمت کرتا ہے۔ آٹھ گھنٹے تک سخت مشقت کر کے ایک ماہ کے بعد تنخواہ لیتا ہے۔ پورے ایک ماہ کی اعصاب شکن محنت، ریاضت کے علاوہ کیا ہے؟۔۔ کسان چلچلاتی دھوپ میں زمین پر ہل چلاتا ہے سر سے لے کر پیر کے انگوٹھے تک پسینہ میں شرابور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ریاضت اور مجاہدہ ہے۔

میری ماں۔۔۔۔ میری بہن۔۔۔ سخت سردی۔۔۔ شدید گرمی میں میرے لئے روٹی پکاتی ہیں، کپڑے دھوتی ہیں، گھر صاف کرتی ہیں، تھک کر بے حال ہو جاتی ہیں۔۔۔ یہ بھی ریاضت ہے۔ جب ہم کوئی کام ریاضت کے بغیر نہیں کر سکتے تو کچھ کئے بغیر روحانیت کیسے سیکھ سکتے ہیں؟ روحانیت لوہے کے چنوں کی طرح ہے، لوگ عمریں گزار دیتے ہیں تب کہیں انہیں روشنی ملتی ہے۔

حضرت خواجہ غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ نے بائیس سال مرشد کی خانقاہ میں پانی بھرا ہے۔۔۔ حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے نانا۔۔۔ باباتاج الدین ناگپوری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں شب و روز نو سال گزارے ہیں۔ انسانیت کے لئے سب سے بڑی مثال اللہ تعالیٰ کے محبوب، باعثِ تخلیق کائنات، رحمتہ اللہ اللعالمین سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے جنہوں نے سالہا سال مراقبہ کیا اور اللہ رب العالمین کا پیغام پھیلانے میں سخت اذیتیں اور تکالیف برداشت کیں۔

قوتِ ارادی مستحکم کرنے کے لئے

☆ چلتے پھرتے کثرت سے اللہ کا ذکر کریں

☆ ہر وقت باوضو رہیں

☆ چالیس نمازیں (فجر کی نماز) باجماعت مسجد میں ادا کریں

☆ نماز کے بعد قرآن کریم کی تلاوت کریں اور ترجمہ پڑھ کر غور کریں۔

مرشد کی تلاش جاری رکھیں اور جب مرشد مل جائے تو تن من دھن سے اس کے حکم پر عمل کریں۔

دعا گو عظیمی

اکتوبر ۱۹۹۸ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

السلام علیکم

یقین ہے آپ خیریت سے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ زندگی میں بہت کچھ میسر ہونے کے باوجود آدمی ان باتوں کی طرف زیادہ متوجہ کیوں رہتا ہے جو میسر نہیں ہوتیں۔ جبکہ ضروریات سب کی پوری ہو جاتی ہے۔ منفی سوچ عام اور آدمی مثبت سوچ سے دور کیوں ہے؟

شکریہ

غوثیہ احمد

عزیزہ برخوادری غوثیہ احمد

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

یہ ایسے سوالات ہیں جو ہر زی فہم اور باشعور آدمی کے ذہن میں گشت کرتے رہتے ہیں اور جب ان کا شافی وکافی جواب نہیں ملتا تو بہت سے لوگ گم کردہ راہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ نہ سمجھنے کی پاداش میں خود فراموشی ان کے اوپر مسلط ہو جاتی ہے اور وہ اس ہستی سے دور ہو جاتے ہیں جو کائنات مین موجود سارے کارخانوں کی مشینوں کے ایک ایک پرزہ کو انرجی بخش رہی ہے۔

منفی سوچ اتنی زیادہ عام ہے کہ آدمی ان چیزوں سے خوش نہیں ہوتا جو اسے حاصل ہیں۔ ان خواہشات کے پیچھے سرگرداں ہے جن کے حصول میں وہ اعتدال کی زندگی سے روگردانی پر مجبور ہیں۔ ہر شخص خیالات میں غلطاں و پیچاں، ارد گرد سے بے نیاز، چہروں پر غم وآلام کی تصویریں سجائے اپنی دنیا میں مگن ہے۔ یہاں وہ بھی پریشان ہے جس کے پاس سونے چاندی کا ذخیرہ ہے، وہ بھی دل گرفتہ ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہے۔

بیماریوں پریشانیوں، خود نمائی اور احساسِ کمتری کے دبیز سایوں نے اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ جتنے لوگ ہیں ان کے اتنے ہی مسائل ہیں مگر ایک بات سب میں مشترک ہے کہ سکون کسی کو حاصل نہیں۔ سب کے ماتھوں پر بے اطمینانی، عدم تحفظ اور محرومی کی شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ سب شکست خوردہ اور نفرت وحقارت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ دولت کی ہوس اور معیارِ زندگی بلند ہونے

کے تقاضوں نے اولاد آدم کے لئے دنیا کو دوزخ بنادیا ہے۔ وجہ تلاش کی جائے تو ایک ہی بات سمجھ میں اتی ہے کہ ہم صبر واستغنا کی نعمت سے محروم ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے۔

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ البقرہ: ۱۵۳

مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ صابر و شاکر نہیں ہیں وہ خود اپنے ارداہ سے مشیت سے دور ہو جاتے ہیں۔ اللہ سے دوری سکون و عافیت اور اطمینان قلب سے محرومی ہے۔ یہ محرومی صبر واستغنا کی لذت سے ناآشنا کر دیتی ہے۔

صبر واستغنا وہ تلوار ہے جس سے ہم مسائل و مشکلات اور عدم تحفظ کی

زنجیریں کاٹ کر پھینک سکتے ہیں۔ جب کسی فرد کو صبر واستغنا کی دولت

مل جاتی ہے تو اس پر مصائب و مشکلات کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے۔

من حیث القوم صبر واستغنا کسی قوم کے مزاج میں رچ بس جاتا ہے تو

معاشرہ سدھر جاتا ہے۔ قومیں حقیقی فلاح و بہبود کے راستوں پر گامزن

ہو جاتی ہے۔

یاد رکھیئے! سکون دل اور خوشی کوئی خارجی شے نہیں ہے، یہ ایک اندرونی کیفیت ہے۔ اس اندرونی کیفیت سے وقوف حاصل ہوتا ہے تو ہمارے اوپر اطمینان و سکون کی بارش بسنے لگتی ہے۔ بندہ اس ہمہ گیر طرزِ فکر سے آشنا ہوتا ہے تو حقیقی مسرت و شادمانی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔۔۔ اسے سکون کی دولت مل جاتی ہے۔

دعا گو

عظیمی

دسمبر ۱۹۹۸ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

محترم و مکرم عظیمی صاحب

اسلام علیکم

اسمائے الٰہیہ کیا ہیں؟۔۔کسی اسم کے مسلسل ورد سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ورد اور وظائف سے فائدہ نہیں ہوتا۔نقصان ہو جاتا ہے۔۔اس کی کیا وجہ ہے؟۔

عبدالرّحیم نظامانی(ٹنڈو جام)

وعلیکم اسلام ورحمتہ اللہ

اللہ کا ارشاد ہے،

لوگو! مجھے پکارو، میں سنوں گا، مجھ سے مانگو، میں دوں گا۔البقرہ

پکارنے یا مانگنے کے لئے ضروری ہے کہ اس ہستی کا تعارف ہمیں حاصل ہو اور ہم یہ جانتے ہوں کہ جس کے آگے ہم احتیاج پیش کر رہے ہیں وہ ہماری احتیاج پوری کر سکتا ہے۔یقین کرنے کے لئے ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ وہ کون سی ذات والا صفات ہے جس سے ہم روزانہ ایک لاکھ سے بھی زیادہ خواہشات پوری کرنے کی تمنا کریں تو وہ پوری کر سکتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ ذات یکتا۔۔۔اللہ ہے۔اللہ نے اپنی صفات کا تذکرہ اپنے ناموں سے کیا ہے۔

اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں۔پس ان اچھے ناموں سے اسے

پکارتے رہو۔لاعراف:۱۸۰

ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو اور صبح و شام اس

کی تسبیح میں لگے رہو۔الاحزاب:۴۲:۴۱

اللہ کا ہر اسم ایک چھپا ہو خزانہ ہے۔ان خزانوں سے واقف لوگ جب اللہ کے نام کا ورد کرتے ہیں تو ان کے اوپر رحمتوں اور برکتوں کی بارش برستی ہے۔عام طور پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام مشہور ہیں۔اس بیش بہا خزانے سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر نام کی تاثیر اور پڑھنے کا طریقہ الگ الگ ہے۔کسی اسم کی بار بار تکرار سے دماغ اس اسم کی نورانیت سے معمور ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے اللہ کے اسم کے انوار دماغ میں ذخیرہ ہوتے ہیں اسی مناسبت سے بگڑے ہوئے کام بنتے چلے جاتے ہیں اور حسبِ دلخواہ نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اللہ کا ہر اسم ،اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی ہر صفت قانون قدرت کے تحت فعال اور متحرک ہے۔ہر صفت اپنے اندر طاقت اور زندگی رکھتی ہے۔جب ہم کسی اسم کا ورد کرتے ہیں تو اس اسم کی طاقت اور تاثیر کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔کوئی ورد،وظیفہ یا عمل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ عمل کرنے والا بندہ اجازت یافتہ ہو۔

قانون: عامل دوسرے کو اپنا عمل بخش دے (بشرطیکہ وہ عامل ہو) تو جسے یہ عمل بخشا گیا ہے اس کے اندر بھی یقین کا وہی پیٹرن بن جاتا ہے جو عامل کا ہے اور ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ ہم ایسا کریں گے تو ایسا ہو گا۔ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ آدمی کے اندر یقین کی قوت کی مناسبت سے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔مطلوبہ فوائد حاصل نہ ہوں تو ہمیں اپنی کوتاہیوں اور پر خطا طرزِ عمل کا جائزہ لینا چاہیئے۔

دوا کے ساتھ پرہیز ضروری ہے۔۔۔۔بدپرہیزی سے دوا غیر موثر ہو جاتی ہے۔کوتاہیوں اور خطاؤں کے مرض میں جو پرہیز ضروری ہے وہ درجِ ذیل ہے۔

☆حلال روزی کا حصول

☆جھوٹ سے نفرت،سچ سے محبت

☆اللہ کی مخلوق سے ہمدردی،

☆ظاہر اور باطن میں یکسانیت،منافقت سے دل بیزاری

☆فساد اور شر سے احتراز

☆غرور و تکبر سے اجتناب

کوئی منافق، سخت دل، مخلوق کو کمتر جاننے والا اور خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے والا بندہ اسمائے الٰہیہ کے خواص سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ کسی اسم کا ورد کرنے سے پہلے مذکورہ بالا صلاحیتوں اور اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنا ضروری ہے۔ بیان کردہ علاج اور پرہیز کے ساتھ اسمائے الٰہیہ کے فوائد و ثمرات اسی طرح حاصل ہوں گے جس طرح ہمارے بزرگ مستفیض ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ان کے فرمودات سے خلق خدا فائدہ اٹھاتی ہے۔

دعا گو

عظیمی

اپریل ۱۹۹۹ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

ریاض صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

مرنے کے بعد زندگی کی تشریح کی جائے تو کہا جائے گا کہ ۔۔۔۔روح نے مٹی کے ذرات سے بنائے ہوئے جسم سے رشتہ منقطع کر لیا ہے اور دوسرے عالم میں وہاں کی فضا کے مطابق ذرات یکجا کر کے ایک نیا جسم تخلیق کر لیا ہے۔

عالم اعراف میں دنیا کی آبادی سے برابر جو لوگ منتقل ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے دراصل یہ اس عالم سے اُس عالم میں روح کی منتقلی ہے۔ عربی زبان میں اسی لئے اُس عالم میں جانے کا نام انتقال ہے یعنی اس عالم سے اُس عالم میں آدمی منتقل ہو گیا۔

روح ہمہ وقت متحرک و سرگرم رہتی ہے۔اس کی اپنی صفات میں سے ایک مخصوص صفت یہ کہ جب تک یہ اپنے لباس سے کلی طور پر قطع تعلق نہیں کر لیتی اس کی حفاظت کرتی ہے۔

ایک آدمی سویا ہوا ہے۔۔۔۔نیند بہت گہری ہے

کراچی میں سویا ہوا آدمی امریکہ کے بازاروں میں گھوم پھر رہا ہے۔

اس کے سوئی چبھو دی جاتی ہے۔

روح امریکہ سے چل کر فوراً اپنے لباس کی پاسبانی کے لئے موجود ہوتی ہے۔ سوئی چبھنا۔۔۔امریکہ سے روح کا کراچی میں آجانا۔۔۔اتنا قلیل وقفہ ہے کہ جس کی پیمائش ممکن نہیں ہے۔اس پیمائش کو آپ لمحہ کا کھربواں حصہ کہہ سکتے ہیں اور لمحے کا کھربواں حصہ کہنا پیمائش کے دائرے میں نہیں آتا۔

مقصد یہ کہ روح کے لئے زمان و مکان کوئی چیز نہیں ہے لیکن جب یہ اپنے لئے مادی جسم بناتی ہے تو اس کو زمان و مکان میں بند رکھنے کے لئے پوری حفاظت کرتی ہے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

جون ۱۹۹۹ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

گرامی مرتبت، روشن ضمیر، اللہ کے دوست عظیمی صاحب

اسلام علیکم

میں طویل عرصہ سے آپ کی تحریریں پڑھ رہا ہوں۔ روشن ضمیری کے بارے میں دل آمادہ فکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ روشن ضمیری کیا چیز ہے؟۔۔۔اس کے بارے میں اس عاجز بندہ نے بہت کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ فاضل علماء نے بڑی بڑی موشگافیاں فرمائی ہیں لیکن میں ناقص العقل ہوں۔ باوجود یہ کہ میں نے بہت گہرا مطالعہ کیا اور اپنے بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر مختلف سوالات کئے لیکن میں ناقص العقل بندہ اس بات کو سمجھ نہیں سکا اور ضمیر مطمئن نہیں ہوا۔

مودبانہ التماس ہے کہ علوم روحانی سے اس کا حل عطا فرمائیں۔ ہمیشہ مشکور رہوں گا۔

جمیل احمد (ہالینڈ)

محترم جمیل احمد صاحب

وعلیکم اسلام ورحمتہ اللہ

ناقص العقل بندہ ہی سمجھ دار ہوتا ہے۔ حضرت فرید الدین رحمتہ اللہ فرماتے ہیں

گرچہ دانا باشی واہل ہنر

خویش را کمتر زہر ناداں شمر

جو شخص سمجھتا ہے کہ میں دانا ہوں بینا، زیرک اور عقلمند ہوں وہ دراصل۔۔۔

آدمی، انسان یا روح کی ساخت پر بندہ جب ذہن مرکوز کرتا ہے تو۔۔۔اندر میں۔۔۔ایک اُبال آجاتا ہے اور یہ اُبال بند ذہن کو کھول دیتا ہے۔ ایسے کھولتے ہوئے پانی پر دیگچی کا ڈھکن اوپر ہو جاتا ہے اور پانی پھیلنے کی صلاحیت بھاپ بن کر لامحدود سمتوں میں گُم ہو جاتی ہے۔ آدمی، انسان اور روح کے الفاظ پر تفکر کیا جائے تو تین زاویوں سے بنی ہوئی ایک تصویر یا مکان ہے۔ اینٹ گارے سے بنا ہوا

کمرا گھر ہے۔ کمرے کے محدودیت آدمی ہے۔ آدمی کے اندر ایک اور آدمی " احسن تقویم" ہے، وہ انسان ہے۔ انسان امرِ ربی ہے اور امرِ ربی روح ہے۔

انسان یا روح کی ساخت اس حقیقت میں منکشف ہوتی ہے

۱۔ اول "واجب" ذات باری تعالیٰ ہے

۲۔ واجب میں کائنات کا وجود اللہ کے ارادے کے تحت موجود تھا اور ہے۔

۳۔ جب اللہ نے کائنات کا مظاہرہ پسند فرمایا تو حکم دیا "کن" یعنی حرکت میں آ، چناچہ کائنات واجب میں جس طرح موجود تھی اس نے پہلی کروٹ بدلی اور حرکت شروع ہو گئی۔

پہلی حرکت یہ تھی کہ موجودات کے ہر فرد کو اپنا ادراک ہوا۔ ہر فرد کی فکر میں یہ بات آئی کہ میں ہوں۔ یہ اندازِ فکر ایک گمشدگی اور محویت کا عالم تھا۔

مخلوق دریائے توحید کے اندر غوطہ زن تھی۔ صرف اتنا احساس تھا کہ میں ہوں کہاں ہوں اور کیا ہوں اور کس طرح ہوں۔۔۔ ادراک نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ روحوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

" الست بربکم" میں ہوں تمہارا رب

یہاں سے انسان یا امرِ ربی کی نگاہ وجود میں آجاتی ہے۔ امر ربی دیکھتا ہے کہ کسی نے مجھے مخاطب کیا ہے اور مخاطب پر اس کی نگاہ پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے

" بلی" جی ہاں میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ میرے رب ہیں۔

یہ ہے وہ مقام جہاں امر ربی نے دوسری حرکت کی یا دوسری کروٹ بدلی، اس مقام پر وہ کثرت سے متعارف ہوا۔ اس نے دیکھا میرے سوا اور بھی مخلوق ہے کیونکہ مخلوق کے ہجوم کا شہود اسے حاصل ہو چکا تھا اور اسے دیکھنے والی نگاہ مل چکی تھی۔ مخلوق کو اپنا احساس اور دوسری مخلوق کی موجودگی کا شہود ہوا۔

قانون: ادراک گہرا ہونے کے بعد نگاہ بن جاتا ہے۔ ادراک جب ہلکا ہو اور خیال کی حدود تک موجود رہے اس وقت تک مشاہدہ کی حالت رونما نہیں ہوتی۔ احساس صرف فکر کی حد تک کام کرتا ہے۔ فکر جب ایک نقطہ پر چند لمحوں کے لئے مرکوز ہو جاتی ہے تو نقطہ میں خدوخال اور شکل وصورت کا مظاہرہ ہوتا ہے اس کو مشاہدہ یا شہود کہتے ہیں۔ ''فکر'' نگاہ کی حیثیت میں چند لمحے اور مرکوز رہتی ہے تو نقطہ گویا ہو جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں نگاہ جو نقطہ کا مشاہدہ کر رہی ہے گویا ہو جاتی ہے یا بولنے لگتی ہے۔

یہ قوت گویائی جسے ''نطق'' کہتے ہیں اگر اس نقطہ کی طرف اور متوجہ رہے تو فکر اور احساس میں رنگینیوں کا چشمہ اُبل پڑتا ہے اور فکر نیرنگی کا ہجوم محسوس کرتی ہے۔ توجہ مزید مرکوز ہوتی ہے تو شہود انسانی میں کشش کی لہریں متحرک ہو جاتی ہیں۔ ان لہروں کی ایک صفت یہ ہے کہ اپنے شہود کو جسے وہ دیکھ رہی ہیں یا محسوس کر رہی ہیں، چھو لیتی ہیں۔

انکشاف ہوتا ہے کہ علم ہی کی جداگانہ حرکات یا حالتوں کا نام خیال، گفتار، شامہ اور لمس ہے۔ جس طرح خیال علم ہے، اسی طرح نگاہ بھی علم ہے اور نگاہ کے بعد تمام حالتیں بھی علم ہیں۔ کوئی حالت ان حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی اور علم کی حدود کے اندر ہی درجہ بدرجہ گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہماری فکر اوپر سے نیچے کی طرف سیڑھیاں اترتی ہے اور ہم فکر کی شکل وصورت کو مختلف احساسات کا نام دیتے چلے جاتے ہیں۔

خیال کو شدت سے محسوس کیا جاتا ہے تو شکل وصورت نظر آتی ہے اور شکل وصورت مزید غور وفکر کے اثر سے گفتگو کرنے لگتی ہے۔ اور اضافہ ہوتا ہے تو یہ گفتگو رنگارنگ لباسوں میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ آخری مرحلہ میں ہم ان رنگارنگ لباسوں کی طرف خود کو کھنچتا ہوا محسوس کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہماری حس ان رنگارنگ لباسوں کو چھو لیتی ہے۔ یہاں پر ہمارا تجسس ختم ہو جاتا ہے، یہ کیفیت فکر انسانی کے لئے لذت کی انتہا ہے۔

اس آخری نکتہ پر پھر فکر انسانی کو لوٹنا پڑتا ہے۔ جس چیز کو ابھی ہم نے چھوا تھا ہماری حس سے دور ہونے لگتی ہے۔ یہ حالت ہماری حس کا ردِ عمل ہے جو مکانیت اور زمانیت کے فعل کا احساس دلاتی ہے۔ مکانیت شعور اور زمانیت لاشعور ہے۔

دعا گو

عظیمی

۲۷ جون ۱۹۹۹ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

محترم عظیمی صاحب

السلام علیکم

آپ کی صحت کے لئے دعا گو ہوں۔اللہ تعالیٰ آپ کی کاوشوں میں مزید برکت عطا فرمائے۔آمین

عرض یہ ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے عوامل پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے امور میں آدمی بااختیار ہے اور ایسے عوامل بھی ہیں کہ وہ بے اختیار ہے۔گہرائی میں غور کیا جائے تو ذہن سوال کرتا ہے کہ

کیا واقعی آدمی بااختیار ہے

اگر وہ بااختیار ہے تو اسے کس حد تک اختیارات حاصل ہیں اور اگر بے اختیار ہے تو پھر جزا و سزا کیا ہے؟

بہت شکریہ

سید افتخار الحسن

عزیز برخوادار سید افتخار الحسن

وعلیکم اسلام ورحمتہ اللہ

آدمی جب تک زندہ ہے اور اس کے اندر عقل و شعور کام کرتا ہے، وہ ایک حد تک بااختیار ہے اور بڑی حد تک بے اختیار ہے۔ مثلاً کوئی آدمی اپنے ارادہ اور اختیار سے سانس لینا شروع کردے تو چند منٹ کے بعد سانس لینا اس کے لئے ممکن نہیں رہے گا۔وہ ارادہ اور اختیار سے سانس نہ لے تو بیمار ہو جائے گا یا اس کے دماغ میں خون جم جائے گا۔

عام زندگی میں ہر فرد کو بھوک لگتی ہے وہ کچھ کھالیتا ہے، پیاس لگتی ہے تو پانی پی لیتا ہے۔یہی حالت آدمی کے اندر اس مشین کی ہے جو مسلسل چل رہی ہے۔اس مشین کے کل پرزے، اعضائے ریئسہ، دل، پھیپھڑے، گردے، جگر، پتا اور آنتوں کی حرکات

ہیں۔سات ارب کی آبادی میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو ارادہ اور اختیار سے اندر کی مشین کو چلاتا ہو۔مشین مکمل غیر اختیاری طور پر چل رہی ہے۔اس مشین میں جو ایندھن استعمال ہوتا ہے اس پر بھی آدمی کی دسترس نہیں ہے۔

ثبوت یہ ہے کہ جب آدمی کے اندر مشین بند ہو جاتی ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت یا توانائی اسے چلا نہیں سکتی۔یہ مشین قدرتی نظام کے تحت بد تریج بند ہوتی ہے اور ایک دم بھی بند ہو جاتی ہے۔بد تریج بند ہونے کا نام بیماری ہے اور مشین کے ایک دم بند ہو جانے کو ہارٹ فیل ہونا کہا جاتا ہے۔آدمی یہ سمجھتا ہے کہ بیماری کا علاج اختیاری ہے۔اگر بیماریوں کا علاج اختیاری ہے تو آدمی مر کیوں جاتا ہے۔

علیٰ ہذاالقیاس زندگی کے بنیادی عوامل اور وہ تمام محرکات جن پر زندگی رواں دواں ہے،اختیار میں نہیں ہیں۔بااختیار ہونے سے مراد یہ ہے کہ بندہ خود اپنے لئے کوئی ایک راستہ اختیار کرتا ہے۔جبکہ ہر آدمی کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ نیکی اور بدی دونوں راستوں میں سے کسی ایک راستہ کا انتخاب کرے۔راستہ اور راستہ کی جزئیات کا تعین پہلے سے ہے اس میں آدمی کا عمل دخل نہیں۔آدمی کو صرف ارادہ کا اختیار دیا گیا ہے۔

زندگی کی ہر حرکت،زندگی کا ہر عمل،زندگی کا ہر تصور،ہر ادراک اور

احساس دو رخوں میں ردوبدل ہو رہا ہے۔ایک کا تعلق شیطنیت سے ہے

اور دوسرے کا تعلق رحمٰن سے ہے۔

جب کوئی آدمی اپنے اوپر ان خیالات کو مسلط کر لیتا ہے اور خود کو دردوبست اس راہ کا مسافر بنالیتا ہے جو راستہ شیطان تک لے جاتا ہے تو اس کے اندر اس راستہ کی تمام بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔آدمی اگر ارادہ اور اختیار سے مسلسل شیطانی راستہ پر چل رہا ہے تو ظاہر ہے اس کے اوپر اس راستہ میں پیش آنے والے تمام حالات وواقعات کا تاثر قائم ہو گا۔

فرد ایسے راستہ کا انتخاب کرتا ہے جس راستہ میں ہرے بھرے درخت ہیں،پھول ہیں،سبزہ زار ہے،آبشاریں ہیں تو راستہ کے مناظر سے لطف اندوز ہو گا،درختوں کا سایہ ملے گا،دماغ راستہ میں موجود پھولوں کی خوشبوؤں سے معطر ہو گا۔سبزہ زار سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملے گی،آبشار کا صاف شفاف اور موتی جیسا پانی پینے کو ملے گا اور اس کے اوپر سرور اور وجدان کی کیفیت طاری ہو گی۔

اس کے برعکس دوسرا بندہ ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جس میں خشک اور کانٹوں سے بھرے درخت ہیں، خزاں زدہ مناظر ہیں۔ راستہ میں ایسے جوہڑ ہیں جن میں تعفن ہے۔ آدمی ان تمام چیزوں سے متاثر ہوگا اور اگر وہ اس راستہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے اور وہ راستہ اختیار نہیں کرتا جس میں سرشاری، شادابی، شگفتگی اور آسائش و آرام ہے تو تعفن، الجھن اور بے زاری کی دنیا سے کبھی آزاد نہیں ہوتا۔

ایک آدمی بُرے ارادے سے گھر سے نکلتا ہے۔ انسپائریشن کا نظام چلانے والے فرشتے اس کے ذہن میں ترغیب کے ذریعے یہ بات ڈال دیتے ہیں کہ یہ کام بُرا ہے اور بُرے کام کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ آدمی ترغیب کو اہمیت نہیں دیتا اور قدم بقدم آگے بڑھ کر ارادہ کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ فرشتے ڈوریوں کو اس کے ارادہ کے تحت حرکت دے دیتے ہیں اور عمل ریکارڈ ہو جاتا ہے۔

آدمی خلوص نیت سے کسی کی مدد کرتا ہے۔ ارادہ کے مطابق حرکت ہوتی ہے تو اس کے اوپر سکون کی حالت قائم ہو جاتی ہے۔ دونوں آدمیوں نے اپنے ارادہ اور نیت کے تحت عمل کیا۔ جیسے جیسے اس پروگرام کو پورا کرنے کے لئے اقدام کی ضرورت تھی اس کے مطابق ڈوریاں ہلتی رہیں۔ عمل ہوتا رہتا ہے اور ساتھ ساتھ ریکارڈ بھی ہوتا ہے۔ جزا و سزا کا تعین اس ریکارڈ کی بنیاد پر ہے۔

اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے ذریعہ نوع آدم کو یہ بتا دیا ہے کہ سیدھی طرف کا راستہ جنت کا ہے اور الٹی طرف کا راستہ دوزخ ہے۔ چونکہ فرد کو چلنے کا اختیار دیا گیا ہے اس لئے اسے یہ اختیار بھی حاصل ہو گیا کہ وہ جو راستہ چاہے اپنے لئے منتخب کر لے۔

دعا گو

خواجہ شمس الدین عظیمی

جون ۱۹۹۹ء

مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

محترم عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

مشہور بزرگ حضرت باباتاج الدین ناگ پوری رحمتہ اللہ علیہ کی ایک کرامت یوں درج ہے کہ ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ مجھے اجمیر شریف جانے کی اجازت دی جائے۔ باباصاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا، کہاں جاتے ہو اجمیر یہیں ہے۔ اسی لمحے اس شخص نے دیکھا کہ وہ اجمیر میں موجود ہے اور وہاں کی سیر کر رہا ہے۔ ازراہ کرم اس بات پر روشنی ڈالیں۔

ڈاکٹر جاوید سمیع (برخیا، ہسپتال، کراچی)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

اس کرامت کے اصول کو سمجھنے کے لئے انسانی ذات اور زمان و مکان پر مختصر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

انسان کی ذات کا ایک حصہ داخلی ہے اور دوسرا خارجی

داخلی حصہ میں زمانیت ہے نہ مکانیت۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ہم کسی عمارت کی ایک سمت میں کھڑے ہو کر اس عمارت کے ایک زاویہ کو دیکھتے ہیں۔ جب اس عمارت کے دوسرے زاویے کو دیکھنا ہوتا ہے تو چند قدم چل کر اور کچھ فاصلہ طے کر کے ایسی جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں جہاں سے عمارت کے دوسرے رخ پر نظر پڑتی ہے۔ نگاہ کا زاویہ تبدیل کرنے میں چند قدم کا فاصلہ طے کرنا پڑتا اور فاصلہ طے کرنے میں تھوڑا سا وقفہ گزرا۔ اس طرح نظر کا زاویہ بنانے کے لئے مکانیت اور زمانیت دونوں وقوع میں آئیں۔

وضاحت سے اسی بات کو ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ جب ہم سات یا گیارہ منزلہ عمارت کو دیکھنا چاہیں تو اس بلڈ نگ تک پہنچنے کے لئے راستے سے گزرنا ہو گا۔ایسا کرنے میں کم یا زیادہ وقت لگے گا۔وقت صرف ہونے میں اور اسپیس سے گزرنے میں دو عوامل کام کرتے ہیں۔

۔ایک وقت اور

۔دوسرا اسپیس سمٹنا

تب ہم نے سات یا گیارہ منزلہ اونچی عمارت کو دیکھا۔

ذات کے خارجی حصے کا زاویہ نگاہ ہے اگر ذات کے داخلی زاویہ نگاہ سے کام لینا ہو تو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ذہن میں بلڈ نگ کا تصور کر سکتے ہیں۔ تصور کرنے میں جو نگاہ استعمال ہوتی ہے وہ اپنی ناتوانی کی وجہ سے ایک دھندلا سا خاکہ دکھاتی ہے لیکن وہ زاویہ ضرور بنا دیتی ہے جو ایک طویل سفر کر کے دیکھنے میں بنتا ہے اگر کسی طرح نگاہ کی ناتوانی دور ہو جائے تو زاویہ نگاہ کا دھندلا خاکہ روشن اور واضح نظارے کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے اور دیکھنے کا مقصد بالکل اسی طرح پورا ہو جائے گا جو سفر کے بعد پورا ہوتا ہے۔اصل چیز زاویہ نگاہ کا حصول ہے جس طرح بھی ممکن ہو۔ہر انسان کے اندر وہ زاویہ نگاہ ہیں (نگاہ دو طرح دیکھتی ہے)

۔یہ ایک زاویہ محدود ہے اور

۔دوسرا زاویہ لا محدودیت ہے

ہم دور دراز مقام کا تصور کر سکتے ہیں۔اونچی سے اونچی عمارت کو دیکھ سکتے ہیں۔ نگاہ کی ناتوانائی کی وجہ سے Bulding کا ایک نقشہ نظر آتا ہے جس کو ہم بلڈ نگ کہتے ہیں۔

نانا تاج الدین ناگپوری رحمتہ اللہ علیہ نے روحانی تصرف سے دھند ہٹا کر سائل کے اندر نظارے کو جلا بخش دی۔اس طرح سائل نے اجمیر کو بالکل اسی طرح دیکھا جیسے کوئی طویل سفر کے بعد اجمیر پہنچ کر وہاں کے مناظر دیکھتا ہے۔

دعا گو

عظیمی

ستمبر ۲۰۱۳ء

ماہنامہ قلندر شعور۔ کراچی

قابل صد احترام عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

رسالہ ''روحانی ڈائجسٹ'' کے شمارہ جنوری ۱۹۹۳ء میں ایک مضمون بعنوان ''خانقاہی نظام'' ادارہ کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔اس مضمون میں صفحہ نمبر ۲۳ پہلے کالم کے آخری پیرا گراف میں لکھا ہے کہ

'' دنیائے آب وگل میں حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی سلسلہ عظیمیہ کے

خانوادے ہیں اور جنات کے عالمین میں شہنشاہ وجنات جناب حضرت عفریت

سلسلہ عظیمیہ کے خانوادے ہیں اور حضور قلندر بابا رحمتہ اللہ علیہ کے مجاز خلیفہ

ہیں۔

اس بات کی وضاحت فرمادیجئے۔طویل عرصہ سے ایک سوال ذہن میں ہے کہ کیا کسی اور عالم میں بھی صاحبِ مجاز خلیفہ اور خانوادے ہوتے ہیں اور وہاں خانقاہی نظام کا نصاب کن خطوط پر مرتب کیا جاتا ہے۔۔۔

جواب کا منتظر

یاسر زیشان (سیالکوٹ)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

میری دانست

سلسلہ کا مفہوم طرزِ فکر۔ایسی طرزِ فکر جو قرآن کریم کے ارشاد اور رسول ﷺ

کے فرمودات پر مشتمل ہو۔

فرمودات میں ایک فرمان عالی مقام یہ ہے کہ بندہ اللہ وحدہ لا شریک کی حاکمیت کو پوری طرح قبول کر کے اللہ کو اول، آخر، ظاہر باطن اور دلوں کا راز جاننے والی ہستی تسلیم کرے اس طرح کہ یقین کی تکمیل ہو جائے۔

جتنے بھی روحانی سلاسل ہیں ان سب کا نقطہ نظر اور مقصد رسول اللہ ﷺ کے احکامات اور قرآن کریم کے مطابق ہونا ضروری ہے اور الحمد اللہ ایسا ہے۔

۱۔ شریعت میں جسمانی اعضاء کے وظائف شامل ہیں۔

۲۔ جبکہ روحانی علوم میں شعور سے ماوراء لاشعور کے تابع ہو کر ایسی کیفیات کا ادراک ہے جو غیر روحانی شعور میں نہیں ہوتا۔

۳۔ دنیا میں مادی اعتبار سے جو بھی کچھ ہو رہا ہے وہ سب لاشعور کے تابع ہے اگر لاشعوری زندگی کی اطلاع (تقاضے) شعور میں منتقل نہ ہوں تو اجسام کی حیثیت تبدیل ہو کر مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

۴۔ زندگی کے دو رُخ متعین ہیں۔ ایک رُخ میں ظاہر ہونا، غائب ہونا، وجود پذیر ہونا، وجود کی موجودگی میں حرکات و سکنات کا نہ ہونا، گھٹنے سے میری مراد غائب ہونا اور بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ ظاہر ہونا۔۔ کوئی بھی شے بشمول آدمی۔۔۔ آدم زاد کا وجود دنیا میں ظاہر ہوتا ہے تو منٹ کے پہلے ہی سیکنڈ سے ظاہر و غائب کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

۵۔ جب بچہ پانچ سال کا ہوتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ بچہ کی عمر کے پانچ سال غائب ہو گئے۔

۶۔ جب شعور کی درجہ بندی پر غور کیا جاتا ہے تو اس کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ زندگی کے ۵ سال، ۱۰ سال، ۴۰ سال، ۶۰ سال غائب ہو رہے ہیں اور زندگی کہیں گم ہو رہی ہے۔

ہر لمحہ کا غائب ہونا دوسرے لمحے کا ظاہر ہونا اسی طرح کروڑوں لمحات کا غائب ہو جانا اس بات کی شہادت ہے کہ لمحات دراصل غیب سے آ رہے ہیں اور غائب ہو رہے ہیں۔

۷۔ علوم وہبی ایک کا نام علم شریعت ہے دوسرے علم کا نام علم لدنی ہے۔ ان دونوں علوم کی پوری پوری وضاحت قرآن کریم میں بیان ہوئی ہے۔ سلاسل طریقت قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات (شریعت) کے تابع ہو کر تکوینی امور انجام دیتے ہیں۔ تمام سلاسل کے امام اور ان کے مجاز خانوادے اس امر کے پابند ہیں کہ وہ علم شریعت اور علمِ طریقت دونوں پر عمل کریں۔

آپ کے سوال کا جواب خود آپ کے سوال میں ہے۔ آپ نے بھائی عفریت عظیمی کے بارے میں خانوادے کا لفظ پڑھ لیا یہی اس کا جواب ہے۔

دعا گو

عظیمی

ستمبر ۲۰۱۳ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

جناب عظیمی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

میں نے پڑھا ہے کہ انسان اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ نیابت کا مطلب ہے کہ جس کی نیابت حاصل ہے اس کے اختیارات بھی حاصل ہوں۔ آدم زاد کو اگر اللہ تعالیٰ کی نیابت کے اختیارات حاصل نہیں ہیں تو وہ حیوان کے دائرہ کار میں زندہ ہے اور اس لئے کہ جو کچھ حیوانات کرتے ہیں وہی سب آدمی کرتا ہے۔ انسان کا مرکزی کردار یہ ہے کہ وہ کائنات کے رموز کو سمجھ کر کائنات پر حکمرانی کرے۔ سوال یہ ہے کہ دانشور چودہ صدیوں سے ہمیں جو بتا رہے ہیں، جو سکھا رہے ہیں اس کے بارے آپ کی کیا رائے ہے؟۔

محمد عرفان (لاہور)

وعلیکم اسلام ورحمتہ اللہ

میں ایک فقیر آدمی ہوں اور اسلام کے دائرہ کار میں رہ کے روحانی علعم کی اشاعت میرا مسلک ہے۔ ہمیشہ اختلافی مسائل سے گریز کرتا ہوں۔ جہاں تک تسخیر کائنات کے رموز اور فارمولوں کا تعلق ہے۔ قرآن خود اس کی شہادت دیتا ہے مطالعہ کائنات کی اہمیت اور حقیقت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور معاشرتی مسائل سے متعلق تقریباً ۱۵۰ آیتیں ہیں دیگر آیات میں تسخیر کائنات کے رموز اور فارمولے بھی بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کریم میں ۶۰۰۰ سے زائد آیتیں ہیں۔

سورۃ اعراف میں ہے: کیا یہ لوگ آسمان اور زمین کی تخلیق پر غور نہیں کرتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موت قریب آگئی ہے۔(۷:۱۸۵)

سورہ عنکوبت میں ہے۔ اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے زمین پر چل پھر کر دیکھو کہ اللہ نے کس طرح زمین کی پیدائش کی ہے۔(۲۹:۲۰)

سورۂ فاطر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔۔ غور کرو پہاڑوں میں سفید، سرخ، سیاہ رنگ پتھروں کی تہیں موجود ہیں۔(۳۵:۲۷)

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے۔۔۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے اختلاف میں عقل مندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔(۲:۱۶۴)

سورۃ آل عمران میں ہے۔۔۔ اگر تم ایمان میں مستحکم ہو تو دنیا میں سربلند رہو گے۔(۳:۱۳۹)

دنیا میں ہم کتنے سربلند ہیں۔ یہ بات ہمارے سامنے ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔

قرآن کریم میں ''حضرت موسیٰؑ'' اور ہمارے بندوں میں ایک بندے کا وضاحت کے ساتھ ذکر ہے۔(۱۸: ۸۲-۶۵) قرآن پڑھیئے اور آیات پر تفکر کیجیئے۔

دعا گو

عظیمی

اکتوبر ۲۰۱۳ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

میرے دوست نے مجھ سے سوال کیا کہ ’’ زندگی کے مقام اور حالات کہاں چلے جاتے ہیں؟۔۔۔‘‘ میں نے انھیں لکھ دیا ہے کہ مجھ میں اتنی قابلیت نہیں جو اس موضوع پر کچھ کہہ سکوں البتہ قبلہ خواجہ عظیمی صاحب کی خدمت میں عرض کر سکتا ہوں جیسا جواب آئے گا تحریر کر دوں گا۔

یہاں تھوڑا عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ’’وقت کی بساط پر‘‘ تو وقت خود انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔آپ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں اور اشاعت میں شامل فرمائیں تاکہ لوگ بھی مستفید ہو سکیں۔

ڈاکٹر مظفر الدین (کراچی)

وعلیکم اسلام ورحمتہ اللہ

جب ہم صحائف انبیاء اور الہامی و آسمانی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ان لاریب کتابوں کا اصل موضوع حیات اور زندگی ہے۔۔زندگی کیا ہے؟۔۔۔اس کی ابتدا اور اس کا ظہور کس طرح ہوتا ہے۔۔۔اور یہ معدوم ہو کر کس طرح اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔۔لیکن صد افسوس کہ مذاہب کے کچھ پیروکاروں نے ان الہامی کتابوں کے اصل مقصد ’’روحانیت‘‘ کے حصول کے بجائے ان تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے کہ عام لوگوں کا ان تعلیمات کی حقیقت تک پہنچنا ایک مسئلہ بن گیا ہے مثلاً مذہب کے کچھ پیروکاروں نے پیدائش اور موت کے بعد کی زندگی کو آواگون کا مسئلہ بنا دیا ہے یا کچھ مذہبی دانشوروں نے انہی الہامی کتابوں کے حوالے سے اللہ کی الرّحمٰن الرحیم ذات کو ڈر و خوف، سزا اور عذاب کی علامت بنا دیا۔

انہی ناقص اور محدود سوچ کے حامل لوگوں کی وجہ سے اللہ کی مخلوق، ایک اللہ اور رسولوں کی ایک ہی تعلیمات پر جمع اور متحد ہونے کی بجائے مختلف مذاہب، فرقوں اور گرہوں میں بنتی چلی گئی لیکن ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب اقوام عالم کسی ایک نقطہ پر متحد ہونے پر مجبور ہونگی اور وہ نقطہ ’’قرآنی وحدت‘‘ ثابت ہو گا۔

اب آیئے اصل بات کی طرف بڑھتے ہیں بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ پیدا ہونے کے بعد جن حالات میں زندگی گزرتی ہے وہ کہاں چلے جاتے ہیں؟۔۔۔اور اگر یہ کہا جائے کہ حالات اور اعمال و حرکات وقت کی بساط پر رواں دواں ہیں تو وقت کی کیا حیثیت ہے۔۔۔آسمانی کتابوں اور اللہ کی آخری کتاب قرآن کریم کے نکتہ نظر سے اللہ تعالیٰ نے وقت حالات اور زندگی کے لئے دو رُخ متعین کئے ہیں ایک رُخ اعلیٰ اور دوسرا رُخ اسفل ہے۔

ہم جب اعلیٰ اور اسفل میں تفکر کرتے ہیں تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اعلیٰ اور اسفل۔۔۔دونوں رُخوں میں عمل کی حیثیت ایک ہی ہے صرف نیت سے کسی عمل یا کردار کو اعلیٰ اور اسفل قرار دیا جاتا ہے۔قرآن مجید میں اعلیٰ اور اسفل دونوں زندگیوں کو ''کتاب المرقوم'' یعنی نوشتہ کتاب کہا گیا ہے۔

ترجمہ: آپ کیا سمجھے علیین (اعلیٰ زندگی) سجین (اسفل زندگی) کیا ہے، لکھی ہوئی

کتاب ہے۔القرآن

موجودہ دور کے سائنسی علوم کی روشنی میں اسے ''فلم'' کا نام دیں تو مسئلہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتا ہے۔آسمانی کتابوں کے ساتھ ساتھ جو باتیں پیغمبروں نے وضاحت سے بیان کی ہیں ان سے بھی مسئلہ اور واضح ہوتا ہے۔حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے، ''زمانے کو بُرا نہ کہو زمانہ اللہ ہے۔''

مختصر تمہید کے بعد اس بات کو عام فہم زبان میں اس طرح کہا جائے گا کہ زندگی، حیات قبل از زندگی اور بعد از موت سب مقام اور حالات نوشتہ کتاب یا ایک فلم ہے۔

بات کچھ یوں بنی کہ کائنات میں جو کچھ ہو چکا ہے جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب کا سب لوح محفوظ پر نقش ہے۔ان نقوش (File) کو جب اللہ تعالیٰ کی تجلی فیڈ (Feed) کرتی ہے تو یہ نقوش مختلف اسکرین پر متحرک ہو جاتے ہیں۔غور طلب بات یہ ہے کہ لوح محفوظ پر زمان و مکان کی یہ کیفیت نہیں ہے جو کیفیت ارض کی اسکرین (Earth Or Screen) پر ہے۔

لوح محفوظ کے قانون کے مطابق لوح محفوظ سے نزول کرنے والے برزخ سے گزر کر ارض پر متحرک ہوتے ہیں۔

ارض یا زمین پر قابل تذکرہ مخلوق انسان ہے۔ روحانی نقطہ نظر سے جب ہم انسانی تخلیق کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں تین بساط (Screens) نظر آتی ہیں۔

۱۔ پہلی بساط پر واہمہ اور خیالات کا نزول ہوتا ہے۔

۲۔ دوسری بساط پر تصورات اور احساسات کے نقوش بنتے ہیں۔

۳۔ تیسری بساط پر مظاہرات خدوخال کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس طرح ان نقوش کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ نقوش دوبارہ ان تین بساط سے گزر کر غیب کے پردے میں چھپ جاتے ہیں۔ یعنی زندگی کے مقام اور حالات، پیدائش اور موت سب ایک فلم (لوحِ محفوظ) ہے جو مسلسل اور متواتر چل رہی ہے۔

جن صاحب دل لوگوں کو روحانی نقطہ عروج نصیب ہو جاتا ہے وہ اس بات کو مشاہداتی طور پر دیکھ لیتے ہیں کہ

انا للہ وانا الیہ راجعون

یعنی ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

دعا گو

عظیمی

نومبر ۲۰۱۳ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

آپ کی خدمت میں ذہنی کشمکش سے مجبور ہو کر ایک مختصر تجربہ پیش کر رہا ہوں جس میں چند سوالات ہیں اُمید ہے کہ آپ میری اس تشنگی کو مختصر جواب سے دور کر دیں گے اور بہت سے قارئین استفادہ کریں گے۔

ہمیشہ سے روئے زمین پر شیطانی قوتیں غالب رہی ہیں یا پھر ان کے اثرات زیادہ محسوس محسوس کئے جاتے رہے ہیں۔ دنیا میں حساس آدمیوں کی تعداد زیادہ رہی ہے یا بے حس آدمیوں کا غلبہ نمایاں رہا ہے۔ کیا حساس شخص دنیا اور آخرت دونوں جگہ پر بے چینی میں مبتلا رہے گا؟

حساس طبیعت لوگ انفرادی یا اجتماعی خودکشی سے ملتے جلتے فعل کیوں کرتے ہیں اور اس کا زمہ دار کون ہے آیا خود یا معاشرہ یا حکومت وقت۔ قیامت کے روز کس سے باز پرس ہو گی؟۔

پروفیسر ظفر علی (کراچی)

سب جانتے ہیں کہ گھپ اندھیرے میں دیا سلائی جلائی جائے تو اندھیرا غائب ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس دن کے اجالے میں اگر اندھیرا کیا جائے تو بہت زیادہ اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً کمرے کی کھڑکیاں بند کر کے ان کے اوپر پردہ ڈالیں گے۔ روشن دان کو بند کریں گے۔ دروازوں کی درزوں پر کاغذ چپکائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کا مفہوم یہ نکلا کہ اندھیرے کو دور کرنے کے لئے اتنا اہتمام کرنا نہیں پڑتا ہے۔

دنیا میں رحمانی قوتوں کا عمل دخل ہے۔ نوع انسانی کی تاریخ بتاتی ہے۔ شیطانی اور تخریبی قوتوں نے جب سر ابھارا ایک حد پر جا کر اس طرح ختم ہو گئیں کہ زمین پر صرف ان کا نشان باقی رہ گیا۔ شداد، نمرود، فرعون جیسی بڑی قوتوں کا حشر تاریخ میں موجود ہے۔

ابھی حال ہی میں ہمارے سامنے شہنشاہ ایران کی مثال ہے۔ تمام تر قوتوں کے باوجود بادشاہ کو اپنے وطن میں قبر بھی نصیب نہیں ہوئی۔ اور وہ مفلوک الحال مسافر کی طرح مر گیا۔ لیبیا کے صدر کی مثال بھی سامنے کی خبر ہے اس نے کئی ٹن سونا چھوڑا ہے اور جس طرح موت واقع ہوئی ہے وہ بھی قابل عبرت ہے۔

حساس ہونا بہت اچھی بات ہے لیکن دیکھنا یہ ہوگا کہ حساس ہونے کی نوعیت کیا ہے۔ اگر حساسیت تعمیر کے لئے ہے تو اس دنیا اور مرنے کے بعد کی دنیا اس کے لئے روشنی ہے اور اگر تخریب کے لئے کوئی شخص حساس ہے یعنی اس کا ذہن صراطِ مستقیم سے ہٹا ہوا ہے تو یہ حساسیت اس بندہ کے لئے تاریکی ہے۔ روشنی کو تعمیر اور تاریکی کو تخریب سمجھا جاتا ہے۔ تعمیر رحمانیت ہے اور تخریب شیطنیت ہے۔۔۔ حساس طبیعت آدمی کے اوپر جب مایوسی کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ خود کو معاشرہ پر بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔۔۔ اور مایوسی اسے پہلے نااُمیدی کے گہرے گڑھے میں گرا دیتی ہے اور پھر دفن کرنے پر مائل ہو جاتی ہے۔ خودکشی وہی آدمی کرتا ہے جو کچھ نہیں کر سکتا۔ جو زندگی (صلاحیتوں) سے مایوس ہو جاتا ہے اور جس کے اندر اپنی ذات کا ادراک ختم ہو جاتا ہے۔

مذہب نااُمیدی مایوسی کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ نااُمیدی سے نکل کر ہاتھ پیر ہلائے جائیں۔۔۔ جو لوگ عملی جدوجہد کرتے ہیں یقین اور عزم کے ساتھ کوشش کرتے ہیں۔۔۔ وہ کامیاب ہو جاتے ہیں اور خودکشی جیسا گھناؤنا عمل نہیں کرتے۔ اللہ نے فرمایا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

دعاگو

عظیمی

دسمبر ۲۰۱۳ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

خواجہ صاحب! میں نے سلاسل کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔آپ کی تحریروں کا ذخیرہ میرے پاس محفوظ ہے اب تک جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کا مشن دنیاوالوں کو سکون آشنا زندگی سے واقف کرنا اور سکون بانٹنا ہے۔

انفرادی حیثیت میں تو بات سمجھ آتی ہے مگر اجتماعی طور پر ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں افراتفری کا ایک عالم برپا ہے۔ہر شخص کسی نہ کسی الجھن میں گرفتار ہے، ذہنی سکون ختم ہو گیا ہے۔عدم تحفظ کے احساس نے آدمیوں کی اکثریت کو زہر ناک بنا دیا ہے۔اخبارات آئے دن حادثات اور انسانوں کی قیمتی جانیں ضائع ہونے کی خبریں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں کبھی بموں کے دھماکے کبھی فلک بوس عمارتوں کے سرنگوں ہونے اور ان کے نیچے بندگان خدا کے ہلاک ہونے کی دل سوز اور وحشت اثر خبریں ہمارے سامنے آتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

آپ سے گزارش ہے کہ ان اجتماعی تباہ کاریوں کا عقدہ بھی کھولئے شاید قوموں کے افراد کو آپ کی بات سمجھ آجائے اور دنیا میں پیار و محبت اور یگانگت جگہ لے لے اور اس طرح اجتماعی سکون مل سکے۔

محمد عارف (لاہور)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ ہم آفات ارضی و سماوی یلغار کی زد میں ہیں بظاہر ان المناک واقعات کے ہونے کی یہ توجیہ پیش کی جاسکتی ہے کہ تعمیر ہوس زر کی وجہ سے یہ نوبت آئی ہے یا زمین کے اندر ردوبدل اس کا سبب ہے۔

یہ باتیں بظاہر کتنی ہی معقول اور وزنی ہوں لیکن اگر ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق انسانی معاشرہ میں آباد لوگوں کے جرائم اور خطاکاریاں ارضی و سماوی آفات اور ہلاکتوں کو دعوت دیتی ہیں۔

جب کوئی قوم قانون خداوندی سے انحراف و گریز کرتی ہے اور خیر و شر کی تفریق کو نظر انداز کر کے قانون شکنی کا ارتکاب کرنے لگتی ہے تو افراد کا یقین کم سے کم ہو جاتا ہے پھر آخر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یقین کی قوت معدوم ہو جاتی ہے اور عقائد میں شک و وسوسہ غالب آجاتے ہیں۔ بے یقینی کی بنا پر قوم توہمات میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے آدمی میں طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے پیدا ہوتے ہیں حرص و ہوس انسان کو اس مقام پر لے جاتی ہے جہاں بے یقینی اور توہماتی قوتیں مکمل طور پر اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان زندگی کی حقیقی مسرتوں سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی کا محور اللہ تعالیٰ کی بجائے ظاہری اور مادی وسائل بن جاتے ہیں اور جب کسی قوم کا انحصار دروبست مادی وسائل پر ہو جاتا ہے تو آفات ارضی و سماوی کا لامتناہی سلسلہ عمل میں آنے لگتا ہے۔۔۔ نتیجتاً افراتفری کا عالم برپا رہتا ہے۔۔۔ قوموں کے افراد کسی نہ کسی شکل میں الجھنوں کا شکار رہتے ہیں۔۔ عدم تحفظ کا احساس اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ بھائی بھائی سے خوف کھانے لگتا ہے۔۔ حتیٰ کہ اپنا سایہ بھی اسے ایک ڈراؤنا ہیولا نظر آتا ہے۔

خون کی رنگت میں سفیدی آجاتی ہے اور بھائی، بھائی کی قیمتی جان ضائع کرنے کا بہانہ تلاش کرتا ہے۔ نتیجہ میں ذہنی سکون کی جگہ خوف لے لیتا ہے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ شک و بے یقینی کو دماغ میں جگہ دینے سے منع فرماتے ہیں۔ یہ وہی شک اور وسوسہ ہے جس سے آدم علیہ اسلام کو باز رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس کے سبب ہمارے باپ آدم علیہ السلام کو جنت کی نعمتوں سے محروم ہونا پڑا۔ شکوک و وسوسے ہی دراصل انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کی تباہ کاریوں کا سبب ہیں۔

دعا گو

عظیمی

جنوری ۲۰۱۴ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تر عورتوں اور کسی حد تک مردوں پر جب جن آتا ہے تو ان کی شخصیت میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ آواز بدل جاتی ہے۔ حیرت ناک قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے بعض اوقات آسیب زدہ یا ایسی زبان بولتا ہے جو وہ خود نہیں جانتا، وہ شخص اپنا تعارف بھی ایک جن کی حیثیت سے کراتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔۔۔ اس کی علمی توجیہہ کیا ہے۔

پروفیسر مشتاق (کراچی)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

نوع انسانی میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے کس کو کبھی نہ کبھی اپنی ان صلاحیتوں کا تجربہ نہ ہوا ہو چاہے بیداری میں یا خواب میں، انسانی حواس دو طرح کے کام کرتے ہیں۔ براہ راست اور بالواسطہ، بالواسطہ کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم آنکھوں سے دیکھتے، کانوں سے سنتے، ہاتھوں سے پکڑتے اور پیروں سے چلتے ہیں حواس کے براہ راست کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بغیر جسمانی نظام کی مدد کے خواب میں خود کو چلتے پھرتے غرض ہر وہ کام کرتے دیکھتے ہیں جو ہم بیداری میں کرتے ہیں۔ کبھی کبھی بیداری میں بھی حواس براہ راست کام کرتے ہیں اور مادی اعصابی نظام معطل ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ حافظہ بھی کام نہیں کرتا۔ مرض ''کابوس'' اس کی مثال ہے۔ سوال مرض کا نہیں، حواس کے براہ راست کام کرنے کا ہے ''کابوس'' کی حالت میں آدمی اپنے بستر سے اٹھتا ہے، کپڑے بدل کر دفتر جاتا ہے، وہاں کام کرتا ہے، واپس آکر کپڑے بدل کر سو جاتا ہے لیکن اسے یہ قطعی یاد نہیں رہتا کہ میں نے سونے کی حالت میں کیا عمل کیا ہے۔

یہ بھی حواس کے براہ راست استعمال ہونے کی ایک طرز ہے۔ یہی کابوس کی کیفیت ہپناٹزم کے ذریعہ انسان پر مسلط کر دی جاتی ہے۔ تو اس وقت بھی وہ بالکل بے ارادہ ہو کر عامل کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ بیداری میں یہ کیفیت بعض اوقات از خود مسلط ہو

جاتی ہے کوئی دوسرا شخص اسے ہپناٹزم نہیں کرتا بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ کو ہپناٹزم کر لیتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی جذبہ، رجحان یا تقاضہ میں اتنی شدت پیدا ہو جائے کہ یہ شدت اعصاب کو مفلوج کر دے جیسے ہی اعصاب مفلوج ہوتے ہیں حواس کا براہ راست استعمال شروع ہو جاتا ہے۔ شدت کی وجہ سے حواس کا رویہ مختلف ہوتا ہے۔ اعصاب کے مفلوج ہو جانے سے جن خلیوں میں یادداشت کا ریکارڈ رہتا ہے وہ اپنا عمل ترک کر دیتے ہیں اور یادداشت کی ترتیب ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں حواس عادت کی بنا پر ایک کہانی بنا لیتے ہیں اور اپنے ہی جسم پر وہ کہانی عملاً استعمال کرتے ہیں۔

براہ راست فعل کی وجہ سے حواس بہت سی ایسی باتوں کا بھی انکشاف کر دیتے ہیں جو پس پردہ ہوتی ہیں اور یہ تب ہوتا ہے جب آدمی صرف آدم کے خول میں بند ہو جاتا ہے۔ یہ بات آپ کو مشکل معلوم ہو گی لیکن غور کیجئے حقیقت سامنے آ جائے گی۔

دعا گو

عظیمی

مارچ ۲۰۱۴ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

جناب استاد محترم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ آپ کی شفقت و عنایات ہمیشہ ہمارے شامل حال رہیں اور اللہ تعالیٰ آپ کی صحت میں برکت عطا فرمائیں۔ آمین

جناب! فی زمانہ سائنس اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ پتہ لگایا جائے کہ ہمارے سیارے کے علاوہ کسی دوسرے سیارے پر آبادی ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ روحانیت اس بارے میں کیا کہتی ہے۔۔۔ میں نے ایسے سادھوؤں، جوگیوں اور سنیاسیوں کے متعلق پڑھا ہے جو اپنی روح کو جسم سے الگ کر کے کائنات میں سفر کرتے ہیں کیا اس طرح کے روحانی سفر کے ذریعہ دوسرے سیاروں کی مخلوقات کو دیکھا جا سکتا ہے۔۔۔

ڈاکٹر سنبل کامران (کراچی)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

ستاروں اور سیاروں کا لا متناہی پھیلا ہوا سلسلہ بے آباد، ویران اور خالی نہیں ہے بلکہ ان میں بیشتر سیارے آباد ہیں۔ خالق کائنات اللہ نے یہ وسیع و عریض کائنات اس لئے پیدا کی ہے کہ مخلوقات اس بات کو جانیں کہ کوئی ان کا خالق ہے اور وہ اس کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ جو سیارے ہمیں نظر آتے ہیں اور جو نگاہوں سے اوجھل ہیں، ان میں سے اکثر پر انسان اور جنات آباد ہیں۔ یہی دو مخلوق ہیں جو اس کائنات کے نظام میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں البتہ ہر سیارے میں مخلوقات کی حرکات و سکنات اور شکل و صورت کی مقداروں میں فرق ہے۔

کسی سیارے میں انسان روشنی کا بنا ہوا ہیولا نظر آتا ہے تو کسی سیارے میں انسان شفاف (Transparent) نظر آتا ہے یعنی ایسے سیارے کا آدمی ہمارے سامنے آجائے تو ہمیں اس کے آر پار نظر آئے گا۔ کسی سیارے میں انسان کا رنگ سونے کی طرح سنہرا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس سیارے پر جس نوع کی مخلوق آباد ہے اس سیارے میں زیلی مخلوق یعنی حیوانات،

نباتات وغیرہ بھی اسی مخلوق کی طرح تخلیق ہوئی ہیں مثلاً جس سیارے میں انسانی مخلوق شفاف (Transparent) ہے تو اس سر زمین پر پیدا ہونے والی ہر شے شفاف (Transparent) ہے۔ درخت کا تنا اس طرح ہے کہ جیسے شیشے کا ایک ستون۔ لیکن اس شیشے کے ستون میں درخت کے متعلق رگیں اور لکڑی کے جوڑ سب موجود ہیں، پتے موجود ہیں، وہ بھی شیشے کی مانند شفاف (Transparent) اور ایک ایک رگ کے درمیان جال نظر آتا ہے۔

ہر سیارے میں وقت کی پیمائش اور درجہ بندی بھی الگ الگ ہے۔ ہر سیارے میں آباد انسان اور جنات میں معاشرتی اور مذہبی قدریں رائج ہیں اور زمینی مخلوق کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ البتہ کشش ثقل کی مقداروں میں فرق کی وجہ سے ہر سیارے کا وقت اور اس کی تخلیق الگ الگ ہے۔

سیاروں اور کہکشانی نظاموں سے متعارف ہونے اور ان کی طرز حیات کا معائنہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذہنی صلاحیت متحرک ہو جو زمان و مکان کی حقیقت سے واقف ہو۔ ذہن میں رفتار کی مقداریں اگر دوسرے سیاروں سے متوازن ہو جائیں تو ہم کسی سیارے کی حدود یا اس کے Atmosphere میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ذہن کو زمان و مکان سے آزاد کرنے کی یہ کوشش روح کی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کا نام ہے۔ کیونکہ روح زمان و مکان کی گرفت سے آزاد ہے۔

قران پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اے گروہ جنات اور انسان اگر تم زمین اور آسمانوں کے کناروں سے نکل سکتے

ہو تو نکل جاؤ تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان سے۔ ۵۵:۳۳

روحانیت اور تصوف میں سلطان کا مطلب روح اور روحانی صلاحیتیں ہیں۔ ٹائم اسپیس سے آزاد ہونے کا طریقہ روحانی استاد کی نگرانی میں مراقبہ ہے۔ کوئی بھی شخص مسلسل مراقبہ کی مشق کر کے اپنے ذہن کو کشش ثقل سے آزاد کر سکتا ہے اور واپس آ سکتا ہے قدرت نے یہ صلاحیت ہر شخص کو ودیعت کی ہے یہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔

دعا گو عظیمی

اپریل ۲۰۱۴ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

"میں" کو ختم کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔۔۔ نفس کا عرفان کیسے حاصل کریں؟۔۔

اظہر محمود (کراچی)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

ارشاد گرامی ہے جس نے خود کو پہچانا اس نے رب کو پہچان لیا۔

مَن عرف نفسہ فقد عرف رَبہُ

نفس کیا ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

موت کیا ہے۔۔۔ یہ سمجھنے کے لئے ہمیں اپنی ذات پر غور کرنا ہوگا۔۔ مرنا۔۔ امر سے ماخوذ ہے۔ انتقال کا مطلب ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونا۔۔ مرنا امر ہونے کے مترادف ہے۔

عزیز دوست خلاصہ تحریر یہ ہے کہ تغیر، تبدیلی ظاہر کا غیب میں چھپنا اور غیب کا ظاہر ہونا یہ سب تغیر ہے۔ تبدیلی ہے۔ شعوری اعتبار سے فکشن ہے۔

خود میں تفکر کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بچہ ظاہر ہونے سے پہلے کہاں تھا نہیں معلوم۔ ظاہر ہونے کے لئے ابتدا کا علم ہے لیکن یہ معلوم دائرہ کار میں نہیں آتا۔ نو مہینہ کے بعد ایک خوبصورت گول مٹول، روشن آنکھیں، معصوم چہرہ نمودار ہوتا ہے۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اپنے پرائے، پڑوسی، دوست احباب سب خوش ہوتے ہیں۔ خوشی اس بات کی علامت ہے کہ شعور نے ایک جیتی جاگتی تصویر کو قبول کر لیا ہے لیکن پانچ سال گزرنے کے بعد جبکہ کافی حد تک نقش و نگار تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ہم بچہ کو تو پہچانتے ہیں لیکن اس کے ماہ و سال کہاں گئے اس کے بارے میں لاعلم ہیں۔

جو جا کے نہ آئی وہ جوانی دیکھی

جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا

سوال یہ ہے کہ دنیا میں آنے سے پہلے ہم کہاں تھے۔۔ لڑکپن، جوانی، بڑھاپا کہاں چھپ گیا؟۔۔۔ جب آپ اس بات پر غور کریں گے آپ کو سوال کا جواب معلوم ہو جائے گا۔

''میں'' دبیز سیاہ پردہ ہے۔ نفس اس پردہ کا رہنما ہے۔۔۔ جس نے نفس کو پہچان لیا اس نے حقیقت کو پا لیا۔ نفس کیا ہے۔۔۔۔ یہ ایک علم ہے جس کے لئے استاد کی ضرورت ہے۔

دعا گو

عظیمی

ستمبر ۲۰۱۴ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

سوال یہ ہے کہ نگاہ کیا ہے؟۔۔۔اکثر اس بات کا تجربہ ہوا ہے کہ کوئی شے ارد گرد موجود ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔بزرگوں نے بتایا کہ جب کوئی شے نہ ملے تو اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر تلاش کریں تو مل جائے گی۔اس بات کا تجربہ میرے ساتھ میرے بچوں نے بھی کیا وہ شے مل جاتی ہے۔سوال پیدا ہوا کہ اس آیت کا نگاہ سے کیا تعلق ہے؟۔۔وہ شے موجود ہوتے ہوئے نگاہ سے کیوں اوجھل رہتی ہے اور اس آیت کے انوار نگاہ یا بصارت کو کس طرح جلا بخشتے ہیں؟۔۔۔آپ سے اس سوال کے جواب کی طلبگار ہوں۔

ریحانہ یوسف (کراچی)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

نگاہ کے تین زاویے ہیں۔اسی طرح خیال کے بھی تین زاویے ہیں۔

۱۔نگاہ جو دیکھتی ہے اس کا عکس Negative ہوتا ہے لیکن جب وہ شے مظہر بنتی ہے یا آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو سیدھی نظر آتی ہے۔

۲۔شعوری نظر Clock Wise ہوتی ہے۔اور شعور سے ماورا لاشعور کی حرکت Anti Clock Wise ہوتی ہے۔

۳۔جب خیال آتا ہے تو اس میں آدمی معنی پہناتا ہے اور معنی پہنانے میں خاندانی روایات،ماحول اور قسم قسم کی دلچسپیاں شامل ہوتی ہیں۔یعنی جو خیال بالکل سادہ ہوتا ہے۔اس میں شعور معنی پہنا کر پیش کرتا ہے۔

اس پیشکش میں آدمی کی دلچسپیاں شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً کچھ پینے کا خیال آیا پانی گرم ہونا چاہیئے یا ٹھنڈا، میٹھا ہونا چاہیئے، شربت ہونا چاہیئے، چائے ہونی چاہیئے۔ شعور اس خیال میں معنی پہناتا ہے۔۔۔ مفہوم یہ ہے کہ خیال کو اوریجنل حالت میں قبول نہیں کیا جاتا۔ مرزا غالب نے فرمایا۔

ہستی کے مت فریب میں آجایئو اسد

عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے

یہ سب شعوری کیفیات ہیں۔ جب تک پانی میں معنی نہ پہنائے جائیں اس کا شربت نہ بنایا جائے، چائے کے روپ میں تبدیل نہ کیا جائے، اس وقت تک خیال نیوٹرل ہے۔ یہ تصوف کا مسئلہ ہے اس پر اگر بار بار غور کیا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ نگاہ کا مطلب عام طور پر یہ لیا جاتا ہے کہ کسی چیز کو دیکھنا۔ لیکن دیکھنا کیا ہے؟۔۔۔ سائنسی نقطہ نظر سے شے کا عکس آنکھ کی پتلی میں تل کی معرفت دماغی اسکرین پر منتقل ہوتا ہے۔ اصل میں شعور جو کچھ دکھاتا ہے وہ Negative کا Positive ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی زمین پر پیروں سے چل رہا ہے اس کو کششِ ثقل یا زمین کی کشش کہا جاتا ہے۔ ذہن میں الٹا عکس اور سیدھا دیکھنا۔۔۔ یہ الگ سوال ہے۔

آدمی میں اُڑنے کی صلاحیت ہے۔ روز سو جاتا ہے۔ آسمانوں میں اُڑتا ہے اور خیال نہیں ہوتا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اس کا اطمینان بخش جواب یہ ہے کہ عورت ہو یا مرد اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

بظاہر کوئی چیز ملنے کا مفہوم واضح نہیں ہوتا لیکن مفہوم پر غور کیا جائے تو لکھنے کے لئے سمندر کے پانی کی روشنائی بھی ناکافی ہے۔ جب ہم قرآن کریم کی آیت

اناللہ وانا الیہ راجعون

پڑھتے ہیں بزرگوں سے منتقل ہوا۔ یقین ذہن کو اس چیز کو جہاں وہ چیز پڑی ہوئی ہے متوجہ کر دیتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ چیز ضروری ہی ملے نہیں بھی ملتی۔

آپ کو چاہیئے سبقاً سبقاً قرآن کریم پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں تفکر کو جگائیں۔ جب ذہن کھل جاتا ہے براہ راست روح کی رہنمائی حاصل ہو جاتی ہے تو اس قسم کے مسائل کے حل خود بخود سامنے آجاتا ہیں۔

دعا گو

عظیمی

اکتوبر ۲۰۱۴ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ

طرزِ فکر کیا ہے؟۔۔۔

طرزِ فکر کیسے بنتی ہے؟۔۔

کہاجاتاہے کہ طرزِ فکر ماحول سے بنتی ہے۔۔۔

جب بچہ دنیا میں آتا ہے اگر ماحول ایسا ہو جہاں والدین کی طرزِ فکر صحیح نہ ہو مثلاً ان کے گھر کا ماحول ٹھیک نہ ہو والدین گالی گلوچ کرتے ہوں، بچہ جہاں پیدا ہو گیا تو اس کی طرزِ فکر تو وہی بنے گی جیسا کہ ماحول ہو گا لیکن اس میں بچے کا کیا قصور۔۔؟

ازراہ کرم اس کی وضاحت فرمادیجیئے۔

مبارک النساء

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

حضور پاک ﷺ کا ارشاد گرامی ہے

ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، ماں باپ اسے اپنے ماحول کے مطابق

مسلمان یا غیر مسلم بنادیتے ہیں۔

(بخاری و مسلم)

اللہ تعالی نے ہر ذی شعور کو عقل اور اچھائی بُرائی کی فہم عطا کی ہے۔اس کی مثال اس طرح بیان کی جاسکتی ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر نعمت اللہ کی دی ہوئی ہے۔سب کے لئے ہے لیکن شعور دورخی پالیسی پر جب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ میرے گھر چوری کیوں ہوئی یا کسی نے میرے حقوق پورے نہیں کئے تو مفہوم یہ نکلتا ہے کہ ملکیت کا تصور آدمی کو پریشان کرتا ہے۔

لیکن جب وہ کسی دوسرے کا حق غصب کرتا ہے اور سونے کے ڈھیر جمع کرتا ہے جبکہ اڑوس پڑوس میں کتنے ہی گھروں میں رات کو چولہا نہیں جلتا اس وقت اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ

اللہ تعالیٰ نے جو وسائل پیدا کئے ہیں اپنی تمام مخلوقات کے لئے پیدا کئے ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے

جو لوگ سونا، چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان

کے لئے عذاب الیم کی بشارت ہے۔

(۹:۳۴)

آپ کا سوال کہ بچی کا کیا قصور ہے؟۔۔۔

بچہ کا کوئی قصور نہیں وہ چٹا کاغذ ہے۔۔۔ جس گھر اور ماحول میں وہ پیدا ہوتا ہے اسی ماحول کی چھاپ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے یعنی بد اخلاق ماحول کی چھاپ بچہ کی ذہنی اسکرین پر نقش ہو جاتی ہے اور اچھے اخلاق کی چھاپ بھی نقش ہو جاتی ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا ذہن کورا کاغذ ہوتا ہے۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔

ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، ماں باپ اسے مسلم یا غیر مسلم بنا دیتے ہیں۔

بچہ کا کوئی قصور نہیں لیکن جزا و سزا ماحول کی چھاپ ہے۔ بچہ کا کوئی قصور نہیں زمہ دار ماحول اور والدین ہیں لیکن جب بچہ بلوغت کو پہنچتا ہے تو قدرت اسے اچھائی اور بُرائی کا تصور عطا فرماتی ہے اور اس کا ذریعہ ضمیر ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ والدین اس اعتبار سے قصور وار ہیں کہ انہوں نے بچوں کی اچھی تربیت نہیں کی اور بالغ باشعور بچہ اس لئے قصور وار ہے کہ اس نے ضمیر کی رہنمائی کو قبول نہیں کیا جبکہ وہ دوسرے معاملات میں نفع و نقصان دونوں کو سمجھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ مجھے نقصان نہ ہو۔

دعا گو

عظیمی

فروری ۲۰۱۵ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

محترم و مکرم حضور مرشد کریم

السلام علیکم

میں نے کتاب لوح و قلم پڑھنا شروع کی ہے اور تیسرے سبق لوح اول پر ہوں۔اس میں فنائے ذات کے مراقبہ کا ذکر ہے۔ اگر کتاب میں مراقبہ یا عمل وذکر کا تذکرہ آئے تو کیا یہ قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ کا حکم سمجھا جائے کہ مراقبہ کرنا ہے اور مراقبہ شروع کیا جائے۔۔۔لوح اول کو سمجھنے کے لئے کیا کیا جائے؟۔۔ سمجھے بغیر آگے پڑھنا صحیح نہیں لگ رہا۔

اباجی، آپ کی زندگی علم اور خدمت خلق ہے۔یہی میری زندگی ہے۔انٹرنیٹ پر قلندر باباولیار حمتہ اللہ علیہ کا فرمان پڑھا کہ ”علم حاصل کرنے کے لئے استاد کی قربت بہت ضروری ہے“۔اباجی، میں تو آپ سے بہت دور ہوں مگر جانتی ہوں کہ نظر کرم ہو تو یہ دوری نہ رہے گی آپ کے لئے نظم لکھی ہے۔اُمید ہے پسند آئے گی۔

آپ کی بیٹی

ظل ثناء

عزیزہ برخوداری ظلِ ثناء

وعلیکم اسلام ورحمتہ اللہ

آپ کا خط پڑھا۔ نظم جو آپ نے لکھی ہے سنی۔ جن جذبات کا خط میں اظہار کیا گیا ہے اس پر غور کیا۔آپ کے ایثار کی نوید دِل خوش کن ہے۔اپنی مصروفیات اور ناتواں صحت کی بنا پر چند بنیادی باتیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ تفصیلات لکھنے کا وقت نہیں ہے۔کسی علم کو سیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ABCD سے واقفیت ہو۔پھر حروف سے جملے کس طرح بنتے ہیں اور کئی جملوں کو یکجا کر کے عبارت کس طرح تشکیل پاتی ہے۔عبارت میں لکھنے والے کا ذہن کس مفہوم کی طرف نشان دہی کر رہا ہے۔یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کا جاننا، سمجھنا فہم وادراک کے ساتھ ضروری ہے۔حضور قلندر باباولیار حمتہ اللہ علیہ کی تصنیف ”لوح و قلم“ الہامی

تحریر ہے۔اس الہامی تحریر میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ پیغمبرانہ تعلیمات کا عکس ہے۔ مرشد کریم حضور قلندر باباولیار حمتہ اللہ علیہ نے ایک صاحب کے سوالات کے جواب میں مکتوب گرامی تحریر فرمایا ہے جو الحمداللہ ریکارڈ ہے۔اس چھوٹے سے خط میں ارشادات گرامی کو جب قرآن کریم کی آیات کے سیاق وسباق میں پڑھا گیا تو ایک خط قرآن کریم کی کم وبیش ۵۰ آیتوں کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔

بہت عزیز بیٹی، علم کی دو طرزیں ہیں۔ایک طرز حصولی۔۔۔اکتسابی۔۔۔۔اور فکشن کا فریم ورک ہے جو اس وقت دنیا میں رائج ہے۔ تصوف میں اس علم کو علم حصولی کہا جاتا ہے۔۔۔اس علم میں الف ب سے ی تک جتنے الفاظ ذخیرہ ہوتے ہیں وہ سب اکتسابی، حصولی یا فکشن ہیں۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے علم حصولی یا علم اکتسابی کی اتنی شاخیں ہیں کہ ان سب کا احاطہ ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔اکتسابی علوم سے مراد یہ ہے کہ علم میں تغیر ہو، عقل و فہم کا دخل ہو، تشبیہات اور استعارے ہوں اور بالآخر علم کی حیثیت سوالیہ نشان بن جائے۔

علم کا دوسرا رُخ یا دوسرا مکتبہ فکر ''علم حضوری'' ہے۔اس علم سے مراد ہے کہ اس میں شعور کی بھول بھلیاں نہ ہوں۔جو نکتہ ہے بس وہ ہے۔ جو معنی ہیں ان میں کسی قسم کا تغیر یا تعطل نہ ہو، رات کا نام کچھ بھی رکھ لیں۔۔۔دو سو زبانوں میں رات کو دو سو ناموں سے متعارف کرایا جاتا ہے لیکن رات، رات ہے۔دن، دن ہے۔

علم حضوری کی تعریف یہ ہوئی کہ عقل و شعور اور شعوری دانائی سے ماورا ہو۔ ہم فرشتہ کا نام لیتے ہیں لیکن شعوری علم کے مطابق فرشتہ کی تعریف ممکن نہیں ہوئی۔اسی طرح تاریک رات میں آسمان پر چمکتے دمکتے تاروں کی بارات دیکھتے ہیں لیکن نہیں جانتے ستارے کیا ہیں۔

ماشاءاللہ آپ کا ذہن کافی حد تک کھلا ہوا ہے۔جب آپ تفکر کریں گی تو بات زیادہ وضاحت سے سمجھ آجائے گی۔

آپ نے وہ مثال قائم کی ہے کہ بغدادی قاعدہ پڑھا نہیں اور M.A کی کتابیں پڑھنا شروع کر دی ہیں۔ علم حضوری کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمہارے سب سمندروں کا پانی روشنائی بن جائے اور روئے زمین پر جتنے بھی درخت ہیں قلم بن جائیں سب ختم و جائیں گے اللہ کی باتیں پوری نہیں ہوں گی بلکہ اتنے ہی سمندروں سے روشنائی اور لاکھوں زمینوں پر موجود درخت کی ہر شاخ قلم بن جائے، وہ سب ختم ہو جائیں گی۔۔۔اللہ کی باتیں باقی رہیں گی۔

زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر جسے

سات مزید سمندر، روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

بے مثال اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ لقمٰن: ۲۷

مجھ فقیر کا مشورہ ہے کہ آپ پہلے ابتدائی کتابیں پڑھیں اور بتدریج پہلی، دوسری، تیسری جماعت کے اعتبار سے روحانی علم کا مطالعہ کریں۔ یہ بات بھی قابلِ تذکرہ اور قابلِ یقین ہے کہ روحانیت کو سمجھنے کے لئے آسمانی کتاب قرآن کریم بہترین قاعدہ اور آخری کتاب ہے۔

خدمت خلق کے بارے میں آپ کے روشن خیالات پڑھے۔ دل خوش ہوا۔ اگر سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کیا کام کرتے ہیں تو اس کا ایک جواب ہے وہ یہ کہ رب کائنات اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی خدمت کرتے ہیں۔ خدمت خلق کے پروگرام سے متعلق آپ نے جو نوید سنائی ہے وہ قابلِ تعریف اور انشاءاللہ قابلِ عمل ہے۔

بات دور اور قریب کی نہیں ہے۔ بہت قریب رہنے والا آدمی بھی بہت دور ہوتا ہے۔۔۔ دور رہنے والا بڑی مسافت حذف کر کے قرب حاصل کر لیتا ہے۔ بات مادیت کی ہے۔ مادیت کی دیوار دوری کی علامت ہے اور روشنی میں دوری نہیں ہوتی۔۔۔ آپ کے گھر میں ٹیوب لائٹ ہے اور گھر سے گرڈ اسٹیشن میلوں دور ہے لیکن جب بٹن آن کر دیا جاتا ہے تو میلوں کی مسافت۔۔۔۔۔۔

دعا گو

عظیمی

نومبر ۲۰۱۵ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

محترم عظیمی صاحب

السلام علیکم

روحانیت کیا ہے؟۔۔میں نہیں جانتا۔۔اس سلسلہ میں سب سے پہلی کسی تحریر کا مطالعہ کیا تو وہ ''ماہنامہ قلندر شعور'' میں ''آج کی بات'' ہے۔پڑھ کر بے حد متاثر ہوا اور یہ ادراک ہوا کہ تحریر میں گہرائی بہت ہے۔راز در راز مخفی ہیں اور میں بہت تھوڑا سمجھ پایا۔سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آدمی تعفن ہے اور زندگی کا اختتام بھی تعفن پر ہوتا ہے۔کیا یہ بات سخت نہیں۔

بہت شکریہ

حسن سید (اسلام آباد)

وعلیکم السلام

میری آپ سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن تحریر ہر آدمی کا آئینہ ہے۔تحریر جب لکھی جاتی ہے تو اس کا تعلق ظاہری حواس سے کم اور اندرونی حواس سے زیادہ ہوتا ہے اس لئے پوری زندگی یا حیات و ممات، مرنا جینا سب خیالات کے تابع ہے۔خیالات دماغ کے تابع ہیں۔جب تک کوئی خیال دماغ میں نہیں آتا زندگی کا کوئی ایک عمل بھی آدمی نہیں کر سکتا۔یہ ایسا راز ہے جس پر اگر نیوٹرل ذہن سے غور کیا جائے تو بات سمجھنا بہت آسان عمل بن جاتا ہے۔

زندگی کو اگر مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا جائے تو دو زاویوں سے

بیان کیا جا سکتا ہے۔یعنی زندگی کے دو رخ ہیں۔

حیات اور موت۔۔۔۔۔۔موت اور حیات

بات اسپرم سے شروع کرتے ہیں۔اسپرم کیا ہے؟خون کے لاکھوں ذرات غائب ہو جاتے ہیں تو اسپرم وجود میں اتے ہیں۔

پہلے دن سے حمل میں تغیر واقع نہ ہو تو تصویر کی تکمیل نہیں ہوئی۔اس تحریر کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں ہر شے پردہ میں چھپ رہی ہے اور ظاہر ہو رہی ہے۔ جو شے ظاہر ہو رہی ہے وہ پردہ میں چھپ رہی ہے اور پردہ میں چھپنے کے بعد پھر ظاہر ہو رہی ہے۔ یہ سلسلہ نو مہینے تک مسلسل جاری رہتا ہے۔نو مہینے کے بعد چھپے ہوئے خون کے قطرے خوب صورت تصویر بن کر ظاہر ہو جاتے ہیں۔

ظاہر ہونے کے بعد ہر دن چھپ رہا ہے، ہر مہینہ چھپ رہا ہے اور ہر سال چھپ رہا ہے۔ایک سال جب پردہ میں چلا جاتا ہے اس طرح کہ نظر نہ آئے تو بچہ کا پہلا سال ختم ہو کر دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔

قابل احترام بھائی۔۔۔بھائی اس رشتہ سے کہ میں فقیر بندہ بھی تقریباً چالیس سال صحافت سے وابستہ رہا ہوں۔

نہایت عزیز دوست۔۔۔زندگی پر غور کیجیئے۔۔۔زندگی کیا ہے؟

زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا۔۔۔ مرنا چھپنا، جینا، ظاہر ہونا پھر چھپنا یعنی مرنا اور ظاہر ہونا یعنی زندہ ہونا۔۔۔ Equation یہ بنی کہ زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کیا ہے؟۔۔۔زندگی دراصل اعمال کی دستاویز ہے۔

قانون یہ ہے کہ کوئی عمل کبھی ایک رخ پر نہیں ہوتا۔

آسمانی کتابوں اور آخری کتاب قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق زندگی غیب و شہود کے علاوہ کچھ نہیں۔

زندگی تین رخوں پر قائم ہے۔

غیب

غیب سے ظاہر ہونا

ظاہر سے غیب میں چھپنا

مطلب یہ ہے کہ آدمی غیب تھا، ظاہر ہوا۔۔۔۔اور پھر غائب ہو گیا۔۔پیدائش سے پہلے وہ جہاں بھی تھا۔پیدائش کے بعد دنیا میں ظاہر ہوا۔زندگی کے وقفے پورے ہونے کے بعد وہ پھر غائب ہو گیا۔۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی تین رخوں سے مرکب ہے۔

دو غیب اور ایک حاضر

ایک حاضر اور دو غیب

میرے دوست! حقیقت ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے لیکن کڑوے پانی کو میٹھا بھی بنایا جا سکتا ہے۔چونکہ آدمی دو رخوں سے مرکب ہے ان دو رخوں میں سے ایک کا نام نیکی، پاکیزگی،اطاعت، فرمانبرداری، صبر، شکر، قناعت و سخاوت رکھتے ہیں اور دوسرے رخ کا نام شقاوت، گناہ، جرم، دوسروں کا ایذا پہنچانا اور خود غرضی ہے۔

جہاں خود غرضی اور شقاوت، بد بختی، حق تلفی، ایذا رسانی، ظلم، احسان فراموشی ہے یہ زندگی کا وہ رخ ہے جس کو ہم برائی یعنی تعفن کہتے ہیں۔دوسرا تعفن پر پردہ ڈالنا ہے۔۔۔دبیز پردہ کہ تعفن باہر نہ آئے۔اس رخ کو سعادت، نیکی، خوش بختی، ایثار، سخاوت ، ہمدردی اور اللہ کے احکام کی تعمیل کہتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ آدمی تعفن، سڑاند، کیچڑ سے بنی تصویر ہے۔اس تصویر کو اگر دھو لیا جائے، صاف ستھرا کر کے روشنیوں اور خوشبو سے معطر کر لیا جائے تو یہ آدمی کا وہ رخ ہے جسے آسمانی کتابوں کے مطابق انسان کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی اور انسان دو الگ الگ یونٹ ہیں اور ان دو یونٹس کو سمجھنے کے لئے خالق کائنات نے اختیار عطا فرمایا ہے۔

جب آدمی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات کو جان لیتا ہے تو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ دونوں رخوں میں سے کسی ایک رخ کا انتخاب کر سکتا ہے۔آدمی تعفن، سرانڈ اور انسان اللہ کا نور ہے۔

آپ کو اور میرے تمام صحافی دوستوں کو آداب و سلام

دعا گو

عظیمی

۲۱ دسمبر ۲۰۱۵ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

محترم و مکرم خانوادہ سلسلہ عظیمیہ

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ

سائنس نے اپنے نظریات کو عملی طور پر پیش کیا۔ جہاز، گاڑی، موٹر سائیکل، موبائل، ٹی وی، فرج، اے سی، کمپیوٹر وغیرہ ایجادات ہیں جو کبھی نظریات تھے، اب عملی شکل میں موجود ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس کی بات کو رد کرنا لوگوں کے لئے ممکن نہیں رہا۔ اس لئے شب و روز ان ایجادات سے استفادہ ہو رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے روحانی نظریات کو عملی مظاہرہ کے طور پر پیش کرنے کے بجائے سینہ بہ سینہ منتقلی پر فوقیت کیوں دی۔ کرامات کیوں چھپائی جاتی ہیں۔ حالانکہ کرامات کے مظاہرہ کے بعد طالب علم کے اندر ذوق و شوق اور یقین کی قوت بڑھ جاتی ہے۔

بہت شکریہ

عابد محمود (سیالکوٹ)

عزیز برخوردار عابد محمود

وعلیکم اسلام ورحمتہ اللہ

ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔ القمر: ۵۳

اگر علم حضوری کے ذہن کے ساتھ تفکر کیا جائے تو کائنات میں ہر شے ، ہر تخلیق، ہر بلندی، ہر پستی۔۔۔ غیب و شہود کی بیلٹ پر قائم ہے اس طرح کہ غیب ظاہر۔۔۔ ظاہر غیب۔۔۔ اور پھر غیب

دیکھنے کی چار طرزیں معین ہیں

۱۔ غیب

۲۔ ظاہر

۳۔ غیب میں دیکھنا

۴۔ غیب الغیب

یہ اس طرح ہوا

غیب ظاہر غیب۔۔۔۔۔ ظاہر غیب ظاہر

Equation یہ بنی کہ غیب ظاہر ہوا، ظاہر غیب ہوا اور غیب پھر ظاہر ہو کر غیب میں چھپ گیا یعنی دو غیب کے درمیان ظہور۔

مثال:

ظاہر۔۔۔۔ اسپرم، اسپرم۔۔۔۔ غیب حاصل۔۔۔ ظاہر

ابتداء غیب مظاہرہ حاضر مظاہرہ غیب

ارشاد ہے

ہر شے اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ البقرہ:۱۵۶

ہر شے اللہ کی طرف سے ہے۔ یعنی اللہ تعالی کا بنایا ہوا پروگرام ہے۔ ہر حرکت غیب ہے۔ غیب مقداروں کے ساتھ حرکت ہے۔ حرکت غیب ہے۔

:Equation

غیب۔۔۔۔۔۔مظاہرہ

مظاہرہ۔۔۔۔۔غیب

غیب۔۔۔۔۔غیب الغیب

میں آپ سے پوچھتا ہوں پیاس لگتی ہے۔سیدھی سی بات ہے کہ پانی پینے کا تقاضا ایک وجود ہے۔وجود میں حرکت ہے۔جب ہم پیاس کو ایک وجود تسلیم کرتے ہیں تو وجود اندر ''میں'' کا تقاضا ہے۔اس تقاضے میں بنیادی بات تشفی ہے یعنی تشفی بھی وجود ہے۔ پانی پی لیتے ہیں خشک آنتیں سیراب ہوتی ہیں اور تقاضا پورا ہو جاتا ہے لیکن تقاضا پورا نہیں ہوتا اس لئے کہ آنتوں کی خشکی دور کرنے کے لئے وقفہ وقفہ سے آنتوں کا سیراب ہونا ضروری ہے۔

موجودہ دور سائنسی ترقی کا دور سمجھا جاتا ہے جب کہ گزرے ہوئے ادوار میں آج کی ترقی کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی ہو چکی ہے۔خواتین و حضرات میں کوئی صاحب تحقیق و تلاش اسلاف کے ان ہی خطوط پر تحقیق و تلاش میں مصروف ہیں جو عارضی اور فکشن ہیں۔۔۔عارضی اور فکشن ہیں اور فکشن رہیں گے۔جس طرح ہزاروں سال پہلے کے سارے تجربات آدمی کی عارضی زندگی کی طرح ریکارڈ ہو چکے ہیں۔

علوم کی طرزیں ہیں۔دو طرزوں سے بیان کرنا پیشِ نظر ہے۔

۱۔ایک حصولی علم: اگر ابتدائی کلاس میں طالب علم یہ سوال کر دے کہ
کہ الف بے کیوں نہیں۔۔بے الف کیوں نہیں تو ہمارے پاس ایسی کوئی
دلیل نہیں جو ہم پیش کر سکیں۔بجز اس کے کہ بزرگوں نے یہی بتایا ہے۔
یہ علم حصولی کی تعریف ہے۔علم حصولی میں تغیر اور تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔
۲۔علم حضوری۔۔۔علم حضوری فکشن سے قطع تعلق کر کے سکھاتا ہے۔
علم حضوری فکشن نہیں ہے اس لئے کہ اس علم میں چون وچراں نہیں ہے۔

کوئی اسٹوڈنٹ سوال کرتا ہے کہ رات دن کیوں نہیں اور دن رات کیوں نہیں۔۔۔ہم کتنی ہی دلیلیں دیں وہ ناقص ہوں گی۔آسمانی کتابوں اور آخری آسمانی کتاب قرآن کریم میں ہے

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے۔ دن کو رات میں داخل کرتا ہے"۔ لقمٰن: ۲۹

"ان کے لئے ایک اور نشانی رات ہے۔ ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے"۔ یٰس: ۵۷

علم حصولی میں جس ترقی کا ذکر ہے اس ترقی میں تغیر ہوتا ہے لیکن تغیر کے باوجود تسلیم کیا جاتا ہے۔ تجربہ یہ ہے کہ محقق نے جو فارمولے بیان کئے ہیں وہ آنے والے دانشوروں نے مسترد کر دیئے ہیں جس کو تسلیم کرنے کے باوجود تحقیق پر دی گئی ڈگری اور سند بدستور قائم ہے۔ جس چیز میں تغیر نہیں ہوتا شعور اسے قبول نہیں کرتا۔ سائنس کی نشوونما مسلسل تغیر ہے۔ آپ سے سوال ہے کہ آپ نے میٹرک کتنے عرصہ میں مکمل کیا؟؟۔۔۔

میٹرک کرنے میں تقریباً بارہ سال لگتے ہیں۔ ایک سال میں ۳۶۵ دن ہوئے۔

بارہ سال میں ۴۳۸۰ دن ہوئے۔ طالب علم ہر روز تقریباً بارہ گھنٹے پڑھتا ہے۔

اس طرح ایک سال میں اس نے ۴۳۸۰ گھنٹے اسکول کی تعلیم کو دیئے۔ اور

میٹرک کرنے کے لئے ۵۲۵۶۰ گھنٹے صرف کئے۔

یہ صرف میٹرک تک کی تعلیم کا عرصہ ہے۔ جتنا عرصہ ہم نے میٹرک حاصل کرنے پر صرف کیا، کیا اسی ذوق اور لگن سے علم حضوری کو اتنا وقت دیتے ہیں جتنا ہم نے دنیاوی علوم کو دیا ہے۔

دعا گو
خواجہ شمس الدین عظیمی
۲ جنوری ۲۰۱۷ء
مرکزی مراقبہ ہال، کراچی

محترم و مکرم مرشد کریم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

اللہ تعالیٰ آپ کی صحت میں برکت عطا فرمائے۔ جاننا چاہتی ہوں کہ آواز کے بارے میں کیا کچھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ مخلوق آواز کو کس طرح سمجھتی ہے۔

شکریہ

آپ کی روحانی بیٹی

بی بی انورادھا (متحدہ عرب امارات)

وعلیکم اسلام ورحمتہ اللہ

پہلی بات یہ سمجھنی چاہیئے کہ آواز کیا ہے؟۔۔آواز جو لفظ بولے جاتے ہیں ہمارے ذہن میں ان کا مفہوم آتا ہے۔۔۔ہم کہتے ہیں جل۔۔۔بولنے والا ج ل= جل کہنے سے اپنے اندر ایک تصویر دیکھتا ہے جس کی شکل و صورت پانی ہے۔یعنی جب آپ نے ج ل= جل کہا، آپ کے علاوہ دوسرا آدمی چونکہ یہ اس کی مادری زبان نہیں ہے یا وہ لاعلم ہے تو وہ کچھ نہیں سمجھے گا لیکن جل بولنے والے ہر فرد کے ذہن میں ایک تصویر بنتی ہے۔ جیسے ہی ج ل (جل) زبان سے ادا ہوتا ہے دماغ کی اسکرین پر پانی کی تصویر بنتی ہے یعنی لفظ بظاہر باہر بولے گئے مگر تصویر اندر کی بنی۔آپ جب کہیں گی جل لاؤ۔ابھی الفاظ پورے نہیں ہوں گے آپ کے دماغ کی اسکرین پر پانی نظر آئے گا۔یہی صورتِ حال ہر لفظ کی ہے۔آپ ایسے آدمی سے جو ہندی نہیں بولتا، کہیں کہ جل لاؤ۔۔۔وہ کچھ نہیں سمجھے گا۔

قانون نمبر ۲: جب ہم کسی شے کو دیکھتے ہیں تو دیکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس شے کی تصویر دماغ کی اسکرین پر نمایاں ہوتی ہے۔ انگریز کو پانی کہیں تو یہی تصویر وہ واٹر بولنے سے سمجھے گا بلکہ اس کے دماغ کی اسکرین پر تصویر بنے گی۔

اس قانون کو غور سے پڑھیئے۔۔۔آپ کو دو حقیقتوں کا ادراک ہو گا۔

پانی یعنی ایسی شے جو نام لینے سے اپنی صفات ظاہر کرتی ہے۔ جیسے بکری،

بکری کا مطلب بکری نہیں۔۔۔ بکری کا مطلب بکری کی صفات ہیں۔

اس قانون کو سمجھنے کے لئے ۲۰ مرتبہ مختلف زاویوں سے غور و فکر کریں۔

نظام کائنات میں کسی چیز کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے پہلے سننا۔۔۔۔

متوجہ ہو کر سننا۔ توجہ یہ ہے اب جو چیز نظر آ رہی ہے اس میں معنی پہنانا۔

یہ آواز کا وہ قانون ہے جو ابھی تک واضح طور پر بیان نہیں ہوا۔

اللہ تعالیٰ جب بحیثیت خالق کے اپنا تعارف کراتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ

تم میری سماعت سے سنتے ہو، میری بصارت سے دیکھتے ہو اور میرے

ادراک (سوچ، سمجھ، فہم، کسی چیز کو گہرائی میں سمجھنا) سے شے کا

تعارف حاصل کرتے ہو۔

اللہ تعالیٰ صاحبِ قدرت ہیں اور بندہ صاحبِ قدرت ہستی کی تخلیق ہے۔ اللہ کو جاننے اور پہچاننے اور اللہ کی باتوں کو سمجھنے، اللہ کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے بندہ تفکر کرتا ہے۔ تفکر یہ ہے کہ جس شے کا نام لیا ہے اس کی وضاحت سامنے آجاتی ہے جو دراصل اللہ کی صفات کا عکس ہے۔

آسمانی کتابوں میں اللہ کا تعارف یہ ہے کہ

انسان پر زمانہ میں ایک وقت ایسا تھا جب وہ نا قابل تذکرہ شے تھا۔

ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ (Zygote) سے تخلیق کیا تاکہ اس کا

امتحان لیں اور اسے سماعت اور بصارت دی۔ ہم نے اسے راستہ

دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ الدھر: ۳۔۱

جو جواب دیا گیا ہے اس میں آپ کے تمام سوالات کا جواب ہے۔ اگر کوئی بات سمجھ نہ آئے تو غور کریں سمجھیں اور لکھ کر پوچھیں۔ جو کچھ آپ نے سمجھا اس کی کم از کم دس مثالیں تلاش کریں اور الگ الگ نمبر وار لکھ کر بھیج دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے، اپنے شوہر کو بہت دعا اور سلام کہیں۔ بچوں کو پیار۔

دعا گو

عظیمی

۲۶ جون، ۲۰۱۸

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

آدم و حوا کے رشتہ سے ہم سب ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔۔ یہ میرا نصیب ہے کہ میں آپ کی بیٹی۔۔۔ آپ کی خدمت میں بذریعہ تحریر حاضر ہو رہی ہوں۔

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ

پیارے ابا جی! میں ننھا سا ذرہ بڑا ہی ناتواں۔۔۔۔ مجھ عاجز و محتاج کو آپ کی شفقت کا سہارا۔۔۔۔ آپ کی ممتا میرا آسرا۔

آپ نے مجھے اللہ سے دوستی اور محبت کا درس دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے اور اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ قرآن کریم کو ترجمہ کے ساتھ پڑھنے کی طرف متوجہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کرنا سکھایا۔ اے شفیق ماں! آپ نے مجھے خلق خدا سے ہمدردی، خوشی میں شریک ہونے اور غم بانٹنے کا سبق دیا۔ اس نادان بچے کو معاف کرنا اور معافی مانگنا سکھایا۔

اے میری ماں! میرے ناز نخرے اٹھانے والی۔۔۔ میری انگلی پکڑ کر چلانے والی۔۔۔ مجھے گندگی میں لتھڑی ہوئی کو پاک صاف کرنے والی۔۔۔ مہکانے والی۔۔۔ سجانے والی۔۔۔ محبت کا درس دینے والی ماں۔۔۔۔ راستہ کے پتھر کو فرش سے اٹھا کر عرش پہ بٹھانے والی ماں! میری تکلیف پر تڑپ جانے والی۔۔۔۔ سکون و راحت پہنچانے والی ماں۔۔۔۔ اس ایثار کا حق کیسے ادا ہو۔۔۔۔ ایک ہی راستہ ہے کہ ماں کے حکم کی تعمیل، ماں کی خدمت اور ماں کی تربیت پر عمل۔

اے پیاری ماں! میں کیا کہوں کہ میری تکلیف ناقابل بیان ہے۔ تجھ کو معلوم ہے۔ اپنی ممتا کی آغوش میں مجھے سمیٹ لے۔ اے میری روحانی ماں! دل ہر لمحہ حاضری کا خواہش مند ہے باادب بانصیب ہونا چاہتا ہے۔

اے علم دوست ہستی! میرے اندر حقیقی علم کی طلب کو سیراب کر۔

پیاری ماں مجھ کو تیری رضا چاہیئے

مقدس قدموں میں مجھ کو پناہ چاہیئے

پیاری ماں مجھ کو تجھ سے تُو چاہیئے

ممتا کے آنچل کی پیاری ہوا چاہیئے

پیاری ماں تیری شفقت و محبت بے انتہا

مطربہ کو آغوشِ محبت میں پناہ چاہیئے

پیاری ماں ! مجھے کچھ کہنا نہیں آتا۔ مدعا بیان کرنا آتا ہے نہ دعا کرنی آتی ہے لیکن ماں انمول ہے کہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور توتلی زبان کو سمجھ جاتی ہے۔ماں تو وہ ہستی ہے جو بن کہے حالِ دل جان لیتی ہے۔ یہ بچہ اپنی ماں کے قدموں میں، خدمت میں جگہ چاہتا ہے کہ بچہ کی جنت ماں کی خدمت میں ہے۔اس بچہ پر ممتا نچھاور فرمادیجیئے اور محبت کا سبق پڑھایئے کہ محبت ایثار ہے اور ایثار کی منزل ہے۔

مطربہ کا بہت بہت سلام قبول فرمایئے۔

آپ کی روحانی بیٹی

غزالہ یاسمین (کراچی)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

بہت پیاری بیٹی ! اللہ تعالیٰ اپنے حبیب رسول اللہ ﷺ کی رحمت سے آپ کو اپنی نعمتوں سے نوازے۔

ہمیشہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے ستر (۷۰) ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔آپ اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر اس بات پر تفکر کریں کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

کوئی بھی کام ہو، اسے انجام دینے سے پہلے یہ ضرور سوچیں کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ جس وقت یہ سوچیں اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اس وقت تصور کریں کہ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔رات کو جتنا بھی وقت ہے، درود شریف پڑھیں اور دن میں ہمہ وقت " یاحی یاقیوم" کا ورد کریں کہ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔

آپ نے بہت پیارا خط لکھا ہے۔بے شک آپ میری بیٹی ہیں اور میں آپ کے لئے دعا گو ہوں۔

اپنے اماں ابااور بہن بھائیوں کو میرا اسلام دیں۔ درخواست ہے کہ میرے لئے دعا کرائیں اور خود بھی دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ آمین۔

دعا گو

عظیمی

دسمبر، ۲۰۱۸

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

محترم مرشد کریم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطافرمائے،مزید لطف واکرام سے نوازے۔ تین معاملات میں رہنمائی درکار ہے۔

۱۔خالی الذہن (یکسوں) ہونے کے ساتھ کامیاب معاشرتی رکن ہونا۔۔۔
یہ صلاحیت کیسے پیدا ہو۔فی الحال پلڑا کبھی اِدھر جھکتا ہے کبھی اُدھر۔
۲۔ایک آواز آتی ہے جو معاملہ فہمی اور درست اقدام کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔یقین کہتا ہے کہ وہ دوست کی آواز ہے۔آوازِ دوست کو کیسے غالب کیا جائے۔۔۔چاہتا ہوں کہ مخلص دوست کی آواز کو پہچان لوں اور وہ مجھے پہچان لے۔
۳۔آپ نے متعدد بار ہدایت فرمائی ہے کہ قرآن کریم کی آخری دس سورتوں اور نماز کا ترجمہ یاد کرلوتاکہ نماز میں توجہ رہے اور مرتبہ احسان کی مشق ہو۔

کچھ بہن بھائیوں نے اصرار کیا کہ میں بذریعہ وڈیو عربی ترجمہ پیش کروں۔انتہائی گناہ گار اور بے وقعت بندہ ہوں مگر احساس ہوا کہ عمومی ضرورت تو موجود ہے۔لہذا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق۔۔۔رسول اللہ ﷺ اور۔۔۔مرشد کی عنایت سے ۹۴ ویڈوز کے ذریعہ ۲۱ سورتوں اور پوری نماز کا ترجمہ مختصر معلومات کے ساتھ عام فہم بات چیت کے انداز میں پیش کر دیا۔دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ ان کا فائدہ ہوا۔دوسری جانب بعض لوگ مجھے سر،جناب،استاد جی وغیرہ بنانے کی کوشش کرنے لگے۔الحمد اللہ میں اپنے مرشد کی نظر کرم کے سبب گمراہی سے محفوظ رہا۔ گزارش ہے کہ اس کا کیا فارمولا ہے کہ بندہ جناب عالی بھی نہ بنے اور اللہ کے محبوب رسول اللہ ﷺ کے روحانی مشن کو فروغ دینے میں کارآمد بھی ہو۔

دوست،مزاج مرشد کا نیاز مند

جواد فرخ (جدہ،سعودی عرب)

عزیز، پیارے فرزند، جواد فرخ صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

اللہ تعالیٰ آپ کو بواسطہ سرورِ کائنات سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کیا کرتے ہیں؟۔۔۔۔قران کریم میں ارشاد ہے

اللہ ایک ہے۔وہ بے نیاز ہے۔اس کی کوئی اولاد نہیں، نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔

اس کا کوئی خاندان نہیں۔ (الاخلاص:۱۔۵)

اللہ تعالیٰ کے ارشادات کے مطابق ان پانچ کلمات میں ایک صفت ایسی ہے جس پر مخلوق ارادی طور پر عمل کر سکتی ہے۔جبکہ وہ جانے یا نہ جانے۔۔۔یہ عمل ہی زندگی ہے۔وہ عمل یہ ہے کہ بندہ مخلوقات سے توقع ختم کر کے اللہ کے ساتھ اپنی تمام اُمیدیں وابستہ کر لے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ بے نیاز ہے لیکن مخلوق بے نیاز نہیں ہے۔مخلوق دروبست خود کو اللہ کے تابع کر دے یعنی نیاز مندی اللہ کے ساتھ قائم کر دے۔اس کا تجربہ پوری زندگی پر محیط ہے۔اللہ چاہتا ہے ہم ظاہر ہو جاتے ہیں اور اللہ چاہتا ہے تو ہم چھپ جاتے ہیں۔اللہ رزق فراہم کرتا ہے۔ماں باپ کو وسیلہ بناتا ہے۔جب تک چاہے زندہ رکھتا ہے اور جب چاہے عالم ظاہر سے عالم غیب میں منتقل کر دیتا ہے۔

وتعز من تشاء تزل من تشاء

اللہ ہر شے پر قادر مطلق ہے

اگر تفکر کیا جائے اور اللہ کی صفات پر غور و فکر کیا جائے تو ایک ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ اللہ اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔اس کی شہادت نو ماہ کے پیٹ میں اور سوا دو سال ماں کے جسم سے غذا فراہم ہونا

ہے۔اللہ تعالیٰ خدمت کو پسند کرتے ہیں۔جو بندے اللہ کی مخلوق کی خدمت کرتے ہیں ایسے بندے نہایت خوش نصیب اور انعام یافتہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور دین و دنیا کی کامیابیاں عطا فرمائے۔آمین

دعا گو

عظیمی

۱۶ اکتوبر ۲۰۱۸ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

محترم مرشد کریم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

الحمداللہ ! اللہ کی توفیق کے ساتھ اسباق اور مشقیں جاری ہیں۔رات سونے سے پہلے شمع بینی کی مشق کرتا ہوں اور اس کے بعد روضہ رسول کے تصور کے ساتھ ۳۱۳ مرتبہ درود خضری کے ورد کی ادائیگی ہے۔اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ صبح نماز فجر کی ادائیگی کے بعد تصورِ شیخ کا مراقبہ جاری ہے۔ کوشش ہوتی ہے کہ اسباق کے دوران ذہن حاضر اور ذکر میں رہے۔ البتہ سانس کی مشق سے مطمئن نہیں ہوں۔ سانس توجہ اور آہستگی سے لیتا اور خارج کرتا ہوں،اس کے باوجود سانس میں گہرائی نہیں ہے۔لگتا ہے پھیپھڑے تنگ اور کم زور ہیں۔راہ نمائی کی درخواست ہے۔

نیاز مند

مبارک الٰہی (اسلام آباد)

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

برادر بجان برابر۔۔۔۔اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور زندگی کے لمحات کو مبارک و مقبول فرمائے۔

آپ کی دل نواز تحریر میں نے پڑھی۔آپ نے سلسلہ کے اسباق کے بارے تفصیل لکھی ہے۔نہایت مبارک بات ہے کہ وقت کی پابندی کے ساتھ اسباق اور مشق جاری ہے۔

عزیز بھائی اللہ کی ہر تخلیق حواس کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔زندگی کے دو رخ متعین ہیں۔

ا۔ایک رخ میں الوژن (illusion) ہے،ٹوٹ پھوٹ ہے،یقین کی لہریں منتشر ہیں۔

ایسی صورت میں کوئی بھی کام،کوئی بھی تحریر یقینی یا ہم جو چاہ رہے ہیں نتیجہ اس کے

مطابق نہیں ہوتا۔اگر خیالات کی تعمیل اور تکمیل میں شکست وریخت ہے تو سارا

عمل الوژن (فریب نظر) کہلائے گا۔

۲۔دوسرا رخ جس کے اوپر پردہ پڑا ہوا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے، وہ یقین

اور ایمان ہے۔

فریب نظر، الوژن۔۔۔۔وہ عمل ہے جسے ثبات نہیں۔اس کے لئے دو رخ حضور پاک ﷺ کی تعلیمات کے مطابق یقین اور بے یقینی ہیں۔آپ نے اسباق کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے میں جدوجہد کرتا ہوں کہ ناغہ نہ ہو۔لیکن عزیز دوست! اگر کسی عمل میں اور مسلسل عمل میں نتیجہ منفی ہو یعنی نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور فوراً تیاری شروع ہو جاتی ہے اور جب خیالات کی تکمیل ہوتی ہے تو وہ چیز نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے البتہ اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں اور اس سارے عمل کی کسوٹی پیغمبران کرام اور خاتم النبیین حضور پاک ﷺ کی تعلیمات کے مطابق ہے۔

ہم اسکول میں پڑھتے ہیں۔ہر سال کلاس میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔پہلی کلاس، دوسری کلاس، میٹرک، بی اے، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی۔۔۔۔یہ سب مراتب ہیں جو الوژن کی بیس (بنیاد) نظر آتے ہیں۔غور کریں گے تو انشاءاللہ انکشاف ہو گا اور اس انکشاف میں مثبت اور منفی دونوں خیالات مظہر بن جائیں گے۔

اللہ کے معاملات میں یقین کارفرما ہے۔

اللہ کو پہچاننا، تسلیم کرنا اور قرآن میں بیان کردہ قانون کو سمجھنا صراطِ مستقیم ہے۔جس طرح نرسری کی کلاس سے آدمی ایم اے یا پی ایچ ڈی تک پہنچ جاتا ہے اسی طرح صلوٰۃ ایسا عمل ہے کہ جس سے ذاتِ باری تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں دو کٹیگری بیان ہوئی ہیں۔

یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔اسے کہو تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو

کہ اسلام لائے ہو، ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

الحجرات: ۱۴

نماز کے ارکان پر غور کیجیئے۔ زندگی کی حرکات و سکنات میں ذہن اللہ کی طرف متوجہ رہے، سب حرکات نماز میں ہیں۔ نماز کے ارکان پر غور کریں تو بات کھل کر سامنے آجائے گی لیکن یہ بھی سوچنا ہے کہ ہم دفتر میں آٹھ گھنٹے بیٹھے ہیں۔ خیالات میں انتشار ہو جائے تو ڈیوٹی پوری نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ پڑھنا بالکل الگ بات ہے لیکن تعلیم میں تفکر کرنا الگ بات ہے۔

''سینہ'' فراخ نہ ہونے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے، اس کے بارے میں تفکر کیجیئے، انشاءاللہ بات کھل جائے گی۔

دعا گو

عظیمی

۱۵جولائی ۲۰۱۹ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

یہ میرا پہلا خط ہے۔ میں پاکستان سے باہر مقیم ہوں۔ پندرہ سال قبل میرے شوہر یہاں آئے۔ اور پانچ سال کے بعد مجھے اور بچوں کو بلوالیا۔ بد قسمتی دیکھیئے کہ یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ بچوں کے مستقبل کی خاطر یہاں رک گئی۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اچھے لوگوں کا ساتھ ملا۔ بچوں کی تعلیم پوری ہوئی اور الحمد اللہ وہ اپنی زندگی میں مصروف ہیں۔ انہیں اب میری ضرورت نہیں۔

میں ملازمت کرتی ہوں اور اللہ نے مجھے توفیق دی ہے کہ میں رضاکارانہ طور پر مخلوق کی خدمت کرتی ہوں لیکن مصروفیت کے باوجود تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ چھ سال پہلے میری ایک نیک شخص سے ملاقات ہوئی۔ وہ عاجزی، دھیما پن، اللہ سے محبت اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہیں۔ ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہماری طبیعت اور مزاج ایک ہے لہذا مشترکہ دوستوں نے ہمیں شادی کا مشورہ دیا۔ وہ اہلیہ کے انتقال کی وجہ سے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے یہ کہہ کر رابطہ ختم کر دیا کہ وہ تصوف میں کسی مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ میں نے پانچ سال انتظار کیا کہ وہ کب واپس آئیں گے۔ چھ ماہ پہلے دوبارہ رابطہ ہوا۔ اہلیہ کے غم سے وہ نکل آئے تھے۔ ہم نے کم سے کم رابطہ رکھا اور شرعی حدود میں رہ کر بات کی۔

ان صاحب نے ایک روز بتایا کہ انہوں نے اپنے استاد سے شادی کے بارے میں مشورہ کیا۔ استاد نے ان کے سارے حالات سُن کر فرمایا۔۔ فی الوقت شادی کرنا مناسب نہیں ہے۔ شادی حضور پاک ﷺ کی سنت ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی راہیں آسان کر دے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب وہ طریقت کی راہ کے مسافر ہیں۔ ہمیں حالات کو قبول کرنا چاہیئے۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں اس مقصد میں کس طرح رکاوٹ ہوں؟ میں ہر قدم پر ان کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔ کاش اتنی محبت میں نے اللہ سے کی ہوتی!

جب سے یہ خبر ملی، دل بہت تکلیف میں ہے۔ اٹھتے بیٹھتے آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے۔ ہم کتنی تکلیف میں کیوں نہ ہوں، خود پر ضبط کر کے سارے کام کرنا پڑتے ہیں۔ دعا کریں کہ دل کو سکون ملے، ایسا لگتا ہے دل پھٹ جائے گا۔ ملازمت سے آتے جاتے سارا راستہ تسبیح پڑھتی ہوں، اللہ سے صبر اور راضی بہ رضا رہنے کی دعا مانگتی ہوں مگر آنسو ہیں کہ رکنے کا نام نہیں لیتے اور نہ دل کو سکون ملتا ہے۔

دعا کی درخواست ہے۔ شکریہ

بنتِ حوا

بہت عزیز، نیک دل خاتون، پیاری بیٹی،

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

روحانیت کا پہلا سبق یہ ہے کہ گوشت پوست کا جسم اور تمام جذبات واحساسات

یعنی دنیا کے تمام معاملات الوژن (illusion)ہیں۔

تصوف میں وقت وہ پروگرام ہے جس پر خالق کائنات

اللہ تعالیٰ نے تخلیقی نظام بنایا ہے۔

حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے

لی مع اللہ وقت ترجمہ: وقت میں میرا اور اللہ کا ساتھ ہے۔

اس راز کو سمجھیئے۔۔۔ایک دور بچپن کا ہوتا ہے، دوسرا دور لڑکپن کا ہے، تیسرا دور جوانی کا ہے، چوتھا دور انحطاط کا اور پانچواں دور بڑھاپا کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ عبوری دور کہاں بنے۔۔۔ کس طرح عمل پذیر ہیں اور اس عارضی پروگرام کے بعد کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔۔۔اس کا علم ہمیں نہیں ہے لیکن صوفی ازم میں وقت بنیاد(Base)ہے۔

نہیں معلوم پیدائش سے پہلے ہم کہاں تھے۔۔۔ یہ بھی علم نہیں کہ اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کہاں چلے جاتے ہیں۔ آدمی جب دنیا میں ظاہر ہوتا ہے تو جوانی تک ایک دور ہے۔ وہ دور گزرتا ہے تو بلوغت کا زمانہ آجاتا ہے۔ بلوغت کی اپنی صفات، ضروریات، تقاضے، برداشت، عدم برداشت، اچھائی اور بُرائی بھی خفیف و ناتواں ہو کر جس غیب سے ظاہر ہوتی ہے اسی غیب میں چھپ جاتی ہے۔

الحمد اللہ ! آپ کا خط پڑھ کر مجھ فقیر کو ادراک ہوا کہ آپ کے اندر تخلیقی صلاحیت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ جہاں تک مسئلے کا تعلق ہے تو یہ زندگی میں ایک تقاضا ہے اور اس تقاضے میں پوری زندگی کے نشیب و فراز کامیابی، ناکامی، اظہار، اطمینان اور بے سکونی سب لوازمات ہیں۔ آپ کے اندر ہمدردی اور تحفظ کے جذبات اللہ کی طرف سے اور رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے احسن صلاحیت کی نشان دہی ہے۔

شادی حضور پاک ﷺ کی سنت ہے۔ اس کو کون منع کر سکتا ہے، حالات جیسے ہی مناسب ہوں شادی کر لینی چاہیئے۔ نہایت عزیز بیٹی ! آپ خود وہ راستہ اختیار کریں جس راستے پر وہ صاحب چل رہے ہیں اور روحانی مکتبہ فکر سے منسلک ہو کر روحانی علوم کی افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع کریں۔ انشاءاللہ راستے کھلیں گے۔ اللہ تعالیٰ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ الحمد اللہ آپ نیک بخت ہیں۔ آپ کے اندر روحانی علوم جاننے کی صلاحیت موجود ہے بس آبیاری کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے، کثرت سے وضو بے وضو "یاحی یاقیوم" کا ورد کریں۔ رات سونے سے پہلے سفید لباس پہن کر ۱۰۱ مرتبہ درود خضری پڑھیں۔

صلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ محمد وسلم

سیرت طیبہ ﷺ کا فہم و فراست کے ساتھ مطالعہ کریں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور آپ کی دعاؤں کو قبول فرمائے۔ آمین

دعا گو

عظیمی

۱۵ اکتوبر ۲۰۱۹ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی

مرشد کریم اباجی کو دل کی گہرائیوں سے سلام۔۔۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

مرشد کریم اپنی ہر بات اور ہر عمل سے ہمیں اللہ کے قریب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس کے علاوہ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔آپ نے ہمیں سکھایا کہ محبت وہ ہے جو اللہ اپنی مخلوق سے کرتا ہے۔اللہ اپنی مخلوق کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے، انہیں شک اور وسوسوں یعنی ظلمت سے نکالتا ہے اور محبت سکھاتا ہے۔

محبت۔۔۔۔یقین ہے۔۔۔۔میں اس محبت کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

آپ کی بیٹی

ج-ب (اسکاٹ لینڈ)

بہت محترم بیٹی

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

ذہن ایسی زمین ہے جو ہمہ وقت اپنے بہن بھائی،اللہ کی مخلوق کی فلاح چاہتی ہے۔ایسی زمین ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی بلا امتیاز خدمت کرتی ہے۔زمین یہ نہیں دیکھتی کہ کون کون کیا ہے۔صرف زمین کے ذہن میں خدمت کا جذبہ ہے جو اسے ماں کی طرح خدمت کرنے پر متوجہ رکھتا ہے۔دھرتی ماں مخلوق کا دستر خوان ہے۔وہ اس دستر خوان پر ہر مخلوق کی مناسبت سے غذا فراہم کرتی ہے۔دھرتی ماں ہر جگہ ماں ہے۔مخلوق کی پیدائش میں اللہ کی لگائی ہوئی ڈیوٹی پوری کرتی ہے۔اصل ماں دھرتی ماں ہے۔یہ دنیا رنگوں کی دنیا ہے۔دیکھیئے سیب،انار،مختلف پھلوں کی بیلیں،چاول،گندم،مختصر یہ کہ زندہ رہنے کے لئے غذائیں جس میں پانی بھی شامل ہے، سب اللہ کے حکم سے زمین فراہم کرتی ہے۔

ہم زمین سے پیدا ہوتے ہیں اور ان وسائل کے تعاون سے زندہ رہتے ہیں۔ ہوا، پانی، آکسیجن قسم قسم کی گیسز۔۔۔۔ بارش، سمندر، دریا، ندی نالے سب زمین کی معاون ہیں۔ جب کوئی اپنے آپ پر اپنی ہستی پر، اپنے وجود پر غور کرتا ہے تو ہر اعتبار سے محفوظ رکھنے کے لئے زمین اپنے اندر اس طرح سمالیتی ہے کہ ہماری بے حرمتی نہیں ہوتی۔

ہم سب جتنی بھی آدم زاد مخلوق ہیں یا دیگر مخلوقات ہیں، زمین سب کے عیب چھپا کر اپنے وجود کو اپنے اندر سمالیتی ہے۔ جب آدمی بدھی سے کام لیتا ہے تو بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہم سب ایک باپ آدم اور ایک ماں حوا کی اولاد ہیں۔ حوا آدم کی اولاد قبائل میں بٹ گئیں۔ جو قبیلے سورج کی شدت میں آباد ہو گئے ان کے رنگ مشکی ہو گئے۔ جو قبیلے ٹھنڈی جگہ آباد ہو گئے وہ سرخی مائل ہو گئے۔ زمین کے جس خطے میں سورج کی شعاعیں پڑیں وہاں کے نقش بدل گئے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی ہم سب آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ ایک ماں باپ آدم و حوا ہیں۔ کروڑوں ماں باپ آدمی کے جد امجد آدم اور حوا ہیں۔

عزیز بیٹی! زمین دھرتی پر کتنے ہی آدم زاد یا مرد عورتیں آباد ہیں وہ سب ایک کنبہ، برادری یا قبیلہ ہیں۔ قوم کی اصلاح کرنے والے جتنے بھی حضرات و خواتین زمین پر آئے انہوں نے اصلاح کی، وہ بھی آدم کی اولاد ہیں اور جو لوگ ان کی بات سن کر پیغمبروں کے نقش قدم پر چلے وہ بھی آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ سعادت مند اولاد خوش نصیب ہے اور دوسری اولاد۔۔۔۔۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے اور آپ کے شوہر کو، بچوں کو دین و دنیا کی نعمتیں عطا فرمائے۔

آپ نے مجھ عاجز فقیر کو باپ لکھا بیٹی بن کر۔۔۔۔۔ خط میں دلی جذبات کا اظہار کیا، میں آپ کے لئے دعا گو ہوں اور چاہتا ہوں ہر آدم زاد کا فرد اس بات کو سمجھے کہ ہم ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ آدم و حوا کی اولاد کثرت سے زمین پر تقسیم ہو گئی اور دھرتی ماں نے رہائش کے لئے مفت جگہ فراہم کی۔

اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر بھیجے۔ پیغمبران کرام نے مخلوق کے لئے دو راستوں کی نشان دہی کی۔ ایک راستہ وہ ہے کہ جس میں عافیت ہے، آرام ہے، آسائش ہے، میٹھی نیند ہے، سکون ہے، خدشات و خطرات نہیں ہیں۔ اور دوسرے راستے میں خدشات، پریشانی، مصیبت، دماغی، الجھن، بے یقینی، دلدل، کانٹے مختصر یہ کہ دوزخ کی عذاب ناک زندگی اور سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ اللہ سے دوری۔ اللہ نے اپنے پیغمبر دنیا میں بندوں کے لئے بھیجے کہ مخلوق کے لئے سیدھے راستے کی راہ نمائی فرمائیں تاکہ لوگ عذاب ناک زندگی سے محفوظ ہوں۔

اپنے شوہر کو بہت سلام، بہت دعا اور بہت پیار، بچوں کو دعائیں

آپ کا روحانی استاد

دعا گو

عظیمی

جنوری ۲۰۲۰ء

ماہنامہ قلندر شعور، کراچی